اسلامی علوم

ایک تعارف

(قرآن، حدیث، فقہ اور تصوف)

مؤلف

ڈاکٹر عبدالوارث خاں



اسلامی علوم

ایک تعارف

(قرآن، حدیث، فقہ اور تصوف)

مؤلف

ڈاکٹر عبدالوارث خاں

Name of the Book : **ISLAMI ULOOM - EK TAARUF**
Name of the Author : Dr. Abdul Waris Khan
Edition : 1428AH/2007AD
Published By : **Islamic Book Foundation**
An Institute of Islamic Research & Publications
1781, Hauz Suiwalan, New Delhi-110 002
Pages : 208
Price : Rs65/-

نام کتاب : اسلامی علوم-ایک تعارف
نام مؤلف : ڈاکٹر عبدالوارث خان
باراوّل : ۲۰۰۴ء
باردوم : ۱۴۲۸ھ/ ۲۰۰۷ء
صفحات : ۲۰۸
قیمت : Rs65/-
کمپوزنگ : ڈائمنڈ گرافکس، نئی دہلی۔۲۵
مطبع : ڈائمنڈ پرنٹرز، دہلی
ناشر :

اسلامک بک فاؤنڈیشن
۱۷۸۱ حوض سوئیوالان، نئی دہلی۱۱۰۰۰۲

Islamic Book Foundation
AN INSTITUTE OF ISLAMIC RESEARCH & PUBLICATIONS
1781, Hauz Suiwalan, New Delhi-110002

ISBN 81-89465-45-7

فہرست مضامین

باب دوم

باب سوم

باب چہارم

☆÷☆÷☆

انتساب

اپنے ان عظیم والدین

کے

نام

جن کی پرورش سے میں اس قابل بنا کہ

یہ خدمت انجام دے سکوں۔

رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِى صَغِيْرًا

(اے ہمارے رب تو ان دونوں پر رحم فرما جیسا کہ انہوں نے مجھے بچپن میں پالا ہے۔)

☆☆☆

پیش لفظ

جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے قیام سے ہی اسکول میں اسلامیات مضمون کی حیثیت سے نصاب میں شامل رہا ہے۔ جو درجہ اول تا یازدہم لازمی ہے اور اس کو پاس کرنا بھی ضروری ہے۔ یونیورسٹی میں اسلامک اسٹڈیز کا شعبہ شروع ہونے کے بعد اسکول میں بھی اس کو بحیثیت اختیاری مضمون متعارف کرایا گیا۔ جس کا مقصد اسلامیات، اسلامی تاریخ، علوم اسلامی سے طلبا کو متعارف کرانا ہے اس کے علاوہ شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے لیے طلبا کو تیار کرنا ہے۔

شعبہ اسلامک اسٹڈیز میں طلباء جامعہ اسکول، بیرون جامعہ اور مدارس سے داخل ہوتے ہیں۔ مدارس سے آنے والے طلبا دوسرے طالب علموں سے زیادہ بہتر ہوتے ہیں جس کی وجہ سے باقی طلبا احساس کمتری کا شکار رہتے ہیں۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے نصاب پر نظر ثانی کی ضرورت پیش آئی۔ پروفیسر اختر الواسع صاحب کی زیر نگرانی نصاب پر غور وخوض کر کے اس کو از سر نو مرتب کیا گیا۔ نیا نصاب مرتب کرتے وقت اس کا خیال رکھا گیا کہ طلبا کو پہلے اسلامی تاریخ سے متعارف کرایا جائے لہذا پہلے سال دور جاہلیت، سیرت پاک ﷺ، خلفائے راشدین، بنو امیہ و بنو عباس اس کے بعد ہندوستان میں عہد سلطنت

مغلیہ حکومت، عرب و ہند کے تعلقات اور ہندوستان میں تہذیبی لین دین کی معلومات فراہم کی جائیں اور دوسرے سال میں علوم قرآنی، علم حدیث، علم فقہ اور تصوف کی بنیادی معلومات سے طلبا کو متعارف کرایا جائے۔

مجوزہ نصاب مرتب کرنے کے بعد محسوس ہوا کہ اسلامیات اور تاریخ سے متعلق بہت سی کتابیں لائبریری اور بازار میں دستیاب ہیں جب کہ علوم اسلامی سے متعلق مواد جن کتابوں میں موجود ہے وہ طلبا کے معیار سے بالاتر ہیں اور جو ہیں بھی ان میں تمام نصاب یکجا نہیں ہے۔ طلبا کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ایک درسی کتاب کا ہونا لازمی ہے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مستند اور معتبر کتابوں سے اس مواد کو آسان زبان میں نصاب کی ترتیب کے مطابق منتقل کر کے درسی کتاب کو تیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو کتابیں آسانی سے دستیاب ہیں ان کی فہرست ہر باب کے آخر میں کتب برائے مزید مطالعہ کے تحت دیدی گئی ہے۔ کیونکہ اس کتاب کا مقصد اسکول کے طلبا کو ذہن میں رکھ کر بنیادی معلومات فراہم کرنا ہے تاکہ وہ امتحان کی تیاری آسانی سے کر سکیں اس لیے ہر باب کے آخر میں اہم سوالات بھی دیدیئے گئے ہیں۔

کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب قرآنی علوم، دوسرا علم حدیث، تیسرا علم فقہ اور چوتھا تصوف سے متعلق ہے۔ کتاب کو مرتب کرتے وقت نصابی ضرورت کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ ان ابواب سے متعلق ابتدائی اور ضروری اہم معلومات کا اجمالی تعارف کرادیا جائے تاکہ طلبا اس سے مستفید و متعارف ہو سکیں۔ کتاب کی زبان آسان رکھی گئی ہے تاکہ طلبا کو دشواری پیش نہ آئے۔ طلبا کی ذہنی سطح کا لحاظ رکھتے ہوئے پیچیدہ اور اختلافی بحثوں سے پرہیز کیا گیا ہے۔

میں استاد محترم پروفیسر اختر الواسع صاحب کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اس کام کے لیے میری ہمت افزائی اور رہنمائی کی اور قیمتی مشوروں سے نوازا۔ اس کے علاوہ مفتی فہیم اختر صاحب (اسلامک فقہ اکیڈمی، دہلی) کے مشوروں سے قابل قدر فائدہ ہوا ان کا ممنون ہوں۔ اپنے ساتھی شکیل احمد اور محفوظ الرحمان نے اپنا قیمتی وقت نکال کر اس کام کو مکمل کرنے میں تعاون دیا جس کی وجہ سے یہ کاوش مکمل ہوئی۔ جناب فراست علی خان صاحب جنہوں نے اس کی اشاعت وطباعت کر کے ہمت افزائی کی اور مغیث احمد قاسمی جنہوں نے بذریعہ کمپیوٹر کمپوزنگ کی، ان سبھی حضرات کا بے حد ممنون و مشکور ہوں۔

میں نے اپنی اس تالیف میں حتی الوسع پوری کوشش کی ہے کہ معلومات مستند اور مسلمہ مآخذ کے ساتھ درج ہوں لیکن فَوْقَ كُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْمٌ کے تحت اپنی مکمل تہی دامنی اور عاجزی کا اعتراف کرتے ہوئے اہل علم سے گزارش کرتا ہوں کہ اگر کوئی فروگذاشت محسوس کریں تو براہ کرم مطلع فرمائیں تاکہ اس کی اصلاح کر لی جائے۔ آخر میں اپنے اہل خانہ اور تمام معاونین کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ:

"رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِیْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا"

ڈاکٹر عبدالوارث خان

مقدمہ

غار حراء میں نبی امی ﷺ پر پہلی وحی ان الفاظ میں نازل ہوئی ''پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا''۔ یہ نزول قرآن کا آغاز تھا، جو تعلیم کے ایک نئے دور کا آغاز کر رہا تھا۔ اس میں ہر انسان کو قلم کے ذریعہ ان تمام باتوں کی تعلیم دی جارہی تھی جن سے وہ ناآشنا تھا اور اس کی تعلیم کا رشتہ اس کے خالق سے مربوط کیا جارہا تھا۔ قرآن کے تیس پارے نازل ہوئے۔ معلّم انسانیت نے آیات قرآنی کی تعلیم دی اور اپنی زندگی اس کے مطابق بنا کر دکھائی۔ یہ آپ کی سنت کہلائی۔ قرآن اور سنت کی تعلیمات نے زندگی اور نظام زندگی کا فکری تصور پیش کیا۔ یہ فقہ اور کلام کہلایا۔ اور اسی کو صالحین و بزرگان دین نے سماج میں برتا تو تصوف و احسان اور تزکیہ کے نام سے عام ہوا۔ ''علوم اسلامی'' کی یہ عمارت ان ہی دو بنیادوں پر قائم تھی کہ تعلیم ہر انسان کا حق ہے اور تعلیم انسان کو اس کے رب سے جوڑ دے۔

علوم اسلامی کے یہ چار عناصر ہیں اور ان کی تاریخ ہی دراصل اسلام کی روشن و تابناک تاریخ ہے۔ یہ ہمارے ماضی کا اثاثہ ہے، جو ہمارے حال کو منور کرتا ہے اور ہمارے مستقبل کی منصوبہ بندی کے لیے روشنی دیتا ہے۔ اسی لیے یہ تعلیمی اداروں اور دانش گاہوں میں نصاب تعلیم کا بنیادی حصہ رہے ہیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اسلام کو اس کی تمام وسعتوں کے ساتھ اور عصر جدید کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر سمجھنے اور برتنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے جامعہ میں اسلامی اقدار کے ساتھ زمانہ کے دوش بدوش چلنے کی روایت رہی ہے۔ بلکہ جامعہ اور اس کی قد آور شخصیات نے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے نقوش راہ متعین کیے ہیں۔ جامعہ کی تعلیمی تاریخ اور اس کے نصاب پر نظر ڈالی جائے تو دیکھا جا سکتا ہے کہ اسلامیات اور اسلامی علوم ومطالعات کے ساتھ جامعہ کی کتنی گہری اور قدیم وابستگی رہی ہے۔

زمانہ رواں دواں ہے۔ اس کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں۔ اور اس کے مطابق تعلیم وتدریس کے نہج اور نصاب میں بھی ردوبدل اور اصلاح وترقی جاری رہتی ہے۔ یہ زندہ تعلیم کی پہچان ہے، جامعہ نے اسلامیات کے نصاب کو بھی ہمیشہ عصری تقاضوں سے ہم آہنگ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس کے مطابق نصابی کتابوں کی تیاری کے لیے اہل جامعہ نے خدمات انجام دی ہیں۔

جامعہ کے اسکول میں جاری اسلامک اسٹڈیز کے نصاب کو مزید بہتر بناتے ہوئے مفید اصلاحات اور سفارشات کی گئیں، ان کی روشنی میں اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ علوم اسلامی کی تاریخ اور بنیادی تعارف پر ایک ایسی کتاب تیار کی جائے جو ایک طرف نصابی ضرورت پوری کرتی ہو اور ساتھ ہی وہ علوم اسلامی کی تاریخ سے متعلق بنیادی معلومات کا ایک قیمتی ذریعہ بن جائے۔

مجھے انتہائی خوشی ومسرت ہے کہ جامعہ کے ایک سابق طالب علم اور جامعہ اسکول میں تعلیم کا عملی تجربہ رکھنے والے، اور ساتھ ہی عملی جذبہ وشوق رکھنے والے استاذ ڈاکٹر عبدالوارث خاں صاحب نے بڑی محنت وجستجو، لگن اور یکسوئی کے ساتھ زیر نظر کتاب تیار کر دی ہے۔ انہوں نے مستند ذرائع سے ان بکھری معلومات کو آسان زبان

اور سہل اسلوب میں بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ یکجا مرتب کر دیا ہے۔ اس میں علوم اسلامی کے چاروں عناصر قرآنی علوم، علم حدیث، علم فقہ اور تصوف کی تاریخ، ان کا تعارف، ان سے وابستہ شخصیات اور کتابوں کا مختصر مگر جامع تذکرہ آ گیا ہے۔ اور اس طرح اس کتاب نے جامعہ اسکول کے نصاب اسلامک اسٹڈیز کی ایک ضرورت پوری کر دی ہے۔ اور اسلامک اسٹڈیز کے طلبہ کے لیے آسانی مہیا کر دی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کی اشاعت سے جامعہ اسکول میں اسلامک اسٹڈیز کی تعلیم اور طلبہ کی صلاحیتوں کا معیار مزید بلند ہوگا اور اسلام کی بہتر تفہیم کے ساتھ سماج میں اچھے انسانی رول کی ادائیگی کے لیے خود کو تیار کرنے میں اس سے مدد حاصل کر سکیں گے۔

ضرورت ہے کہ تعلیم کے مختلف مراحل کے لیے عصری تقاضوں کے پیش نظر عصری زبان و اسلوب میں ایسی ہی نصابی کتابیں تیار کی جائیں۔ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مصنف کی اس کوشش کو قبول فرمائے اور اس کتاب کو نافع بنائے (آمین)

۱۶/ جنوری ۲۰۰۴ء
۲۳/ ذی قعدہ ۱۴۲۴ھ

پروفیسر اختر الواسع
ڈین فیکلٹی آف ہیومینیٹیز اینڈ لنگوئجیز
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی - ۱۱۰۰۲۵

باب اول

علم قرآن

وحی کا آغاز: قرآن کریم حضور اکرم ﷺ کی پیدائش کے اکتالیسویں سال نازل ہونا شروع ہوا۔ آپ ﷺ نبوت سے پہلے اپنی بے چین طبیعت کی تسکین کے لیے مکہ مکرمہ سے باہر غارِ حرا میں تشریف لے جاتے اور وہاں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے اور روزے رکھتے۔ آپ ﷺ سے پہلے بھی دوسرے نبیوں اور رسولوں کا یہ طریقہ رہا ہے کہ راہِ حق کی تلاش اور اپنی بے چین طبیعت کی تسکین کے لیے آغاز وحی سے پہلے یعنی نبی بنائے جانے سے پہلے وہ اکثر تنہائیوں میں اللہ تعالیٰ کی عبادت و ریاضت کرتے رہے ہیں۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ بھی غارِ حرا میں عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے اور اللہ تعالیٰ سے لو لگاتے۔ کئی سالوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا یہاں تک کہ وہ وقت آ گیا جب کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو نبوت کی عظیم ذمہ داری سے سرفراز کرنے کا فیصلہ کیا اور آپ ﷺ کے پاس اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کا پیغام لے کر فرشتہ وحی جبرئیل امین علیہ السلام تشریف لائے اور فرمایا ''اقْرَاء'' (پڑھو) آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''میں پڑھنا نہیں جانتا'' تو جبرئیل علیہ السلام نے نبی کریم ﷺ کو اپنے سینہ سے لگا کر بھینچا اور اس عمل کو تین بار دہرایا۔ اس کے بعد حضور اکرم ﷺ نے

جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ قرآن کریم کی یہ پہلی آیت پڑھی:

"اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ"

ترجمہ: پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے تم کو پیدا کیا۔ (سورۃ العلق۔آیت ۱)

یہ آغاز وحی تھا اس کے بعد حضور اکرم ﷺ بے چینی و گھبراہٹ میں گھر تشریف لائے اور پورے واقعہ کا تذکرہ اپنی اہلیہ حضرت خدیجہؓ سے کیا۔ حضرت خدیجہؓ نے آپ ﷺ کو دلاسا دیا اور فرمایا کہ "آپ ﷺ غریبوں اور محتاجوں کا خیال رکھتے ہیں اور ضرورت مندوں کے کام آتے ہیں۔ لہذا اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو ضائع نہیں کرے گا" اس کے بعد اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل (جو عیسائی عالم تھے) کے پاس لے گئیں۔ ورقہ بن نوفل نے پورے واقعہ کو سن کر کہا کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور یہ فرشتہ وحی ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا کرتا تھا۔ اگر میں اس وقت تک زندہ رہا جب کہ آپ کی قوم آپ کو نکال دے گی تو میں آپ کی مدد کروں گا لیکن کچھ عرصہ کے بعد ورقہ بن نوفل کا انتقال ہو گیا۔

تعارف وحی

لغوی معنی: وحی کے لغوی معنی اشارہ کرنے یا دل میں کوئی بات ڈالنے کے ہیں۔

اصطلاحی معنی: شریعت کی اصطلاح میں وحی اس پیغام کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کے کسی رسول یا نبی پر آتا ہے۔ جسے جبرئیل علیہ السلام لے کر آتے ہیں یا کسی دوسرے طریقہ سے اللہ تعالیٰ نبیوں کو علم عطا کرتا ہے۔

قرآن کریم میں "وحی" کا استعمال مختلف معانی میں ہوا ہے مثلاً:

(۱) اشارہ کرنا۔ "فَاَوْحٰی اِلَیْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُکْرَۃً وَّ عَشِیًّا"

(سورہ مریم۔ آیت ۱۱)

ترجمہ: اس نے اشارے سے ان کو ہدایت کی کہ صبح و شام تسبیح کرو۔

(۲) دل میں بات ڈالنا۔ "وَاَوْحَیْنَا اِلٰی اُمِّ مُوْسٰی اَنْ اَرْضِعِیْهِ"

(سورہ قصص۔آیت ۷)

ترجمہ: اور ہم نے موسیٰ کی ماں کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ اس کو دودھ پلاؤ۔

(۳) فطری حکم۔ "وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا"

(النحل۔آیت۔۶۸)

ترجمہ: اور دیکھو تمہارے رب نے شہد کی مکھی پر یہ بات وحی کردی کہ پہاڑوں میں اپنے گھر بنا۔

(۴) بے جان چیزوں کو حکم دینا۔ "یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا. بِاَنَّ رَبَّکَ اَوْحٰی لَهَا"

(الزلزال۔آیت ۵۔۴)

ترجمہ: اس روز زمین (اپنے اوپر گذرے ہوئے) حالات بیان کرے گی کیونکہ تیرے رب نے اسے (ایسا کرنے کا) حکم دیا ہوگا۔

(۵) اللہ تعالیٰ کا پیغمبروں کے پاس پیغام بھیجنا۔ "اِنَّا اَوْحَیْنَا اِلَیْکَ کَمَا اَوْحَیْنَا اِلٰی نُوْحٍ وَّالنَّبِیّٖنَ مِنْ م بَعْدِهٖ."

(سورہ النسا۔آیت۔۱۶۳)

ترجمہ: اے نبی ﷺ ہم نے تمہاری طرف اسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوحؑ اور اس کے بعد کے پیغمبروں کی طرف بھیجی تھی۔

(۶) وَ کَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰی تَکْلِیْمًا"

(سورہ النسا۔آیت۔۱۶۴)

ترجمہ: اور ہم نے موسیٰ سے اس طرح گفتگو کی جس طرح گفتگو کی جاتی ہے۔

وحی کی ضرورت

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اشرف المخلوقات بنا کر۔ علم وعقل کے زیور سے آراستہ کیا اور اس کی ساری زندگی کی ترقی وفلاح و بہبود کے لیے ہر طرح کے جسمانی وروحانی سامان ووسائل مہیا کیے۔ لیکن یہ ساری چیزیں اور ضرورتیں اس کو حقیقت کی طرف لے جانے میں پوری رہنمائی نہیں کرسکتیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں سے ہی کچھ

لوگ منتخب فرمائے جو سیرت و کردار میں عام لوگوں سے بہتر تھے اور انھیں پیغمبر بنا کر بھیجا۔ آخری نبی حضرت محمد ﷺ کی سیرت تو اتنی پاکیزہ ہے کہ بڑے سے بڑا دشمن بھی آپ کی سیرت پاک پر کبھی نکتہ چینی نہیں کر سکا حد یہ کہ جس زمانے میں آپ ﷺ دعوت اسلام دے رہے تھے اور لوگ آپ ﷺ کی انتہائی دشمنی پر اتر آئے تھے حتیٰ کہ آپ ﷺ کی شہادت کا منصوبہ بنا چکے تھے اس وقت بھی وہ اپنی امانتیں آپ ﷺ کے پاس ہی رکھواتے تھے۔

وحی کی ضرورت اس لیے بھی پڑی کہ اللہ تعالیٰ جو ساری کائنات کا مالک اور بادشاہ ہے اس کی شان کے خلاف یہ بات ہے کہ وہ ہر ایک انسان سے مخاطب ہو جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کا ایک معمولی بادشاہ بھی اپنا پیغام معتبر لوگوں کے ذریعہ ہی دوسروں تک پہونچاتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ انسانی عقل خدا تعالیٰ کی مرضی اور منشاء کو بہت مشکل سے سمجھ سکتی ہے اور مکمل طور پر قابلِ اعتماد بھی نہیں ہے لہذا خالق کائنات نے اپنی مرضی سے لوگوں کو آگاہ کرنے کے لیے کچھ لوگوں کا انتخاب کیا جو عام انسانوں سے ہر میدان میں بلند اور برتر تھے اور انھیں اپنا پیغام دے کر بھیجا۔

تیسری وجہ یہ کہ اس دنیا میں ہر انسان کو اپنا مقررہ وقت گذارنے کے بعد ایک مستقل ابدی زندگی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ انسان کہیں دنیا کی اس خوبصورت اور دلکش زندگی میں گم نہ ہو جائے اس لیے راہ ہدایت دکھانے کے لیے اللہ نے پیغمبر بھیجے جنھوں نے سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کی۔ نبیوں اور رسولوں کا یہ سلسلہ آدم علیہ السلام سے شروع ہوا اور ہر قوم، زمانے اور علاقے میں نبی و رسول آئے اور آخری نبی حضرت محمد ﷺ کے ذریعہ صداقت اور حقانیت کا پیغام پہونچا کر مکمل ہوا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ”وہ (خدا) وہی ہے جو خود اور اس کے فرشتے تم پر رحمت

بھیجتے ہیں تا کہ وہ تم کو تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آئے اور اللہ مومنوں پر بڑا رحم کرنے والا ہے۔ (سورۃ احزاب، آیت-۴۳)

وحی کی قسمیں

وحی کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ وحی متلو: وحی متلو سے مراد اللہ کے وہ احکامات اور پیغام ہیں جو اللہ تعالیٰ نے جبرئیل امین علیہ السلام کے ذریعہ حضرت محمد ﷺ کے پاس بھیجے اور قرآن مجید کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہیں جن کی تلاوت کی جاتی ہے۔

۲۔ وحی غیر متلو: وحی غیر متلو سے مراد اللہ تعالیٰ کے وہ احکامات اور پیغام ہیں جو حضرت محمد ﷺ نے بتائے یہ احادیث کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہیں جن کی قرآن مجید کی طرح تلاوت نہیں کی جاتی۔

نزولِ وحی کے مختلف طریقے

رسول اکرم ﷺ پر مختلف نوعیّتوں اور طریقوں سے وحی آتی تھی، علماء نے مندرجہ ذیل طریقوں کا تذکرہ کیا ہے۔

۱۔ رویائے صادقہ

اس کے معنی ہیں "سچا خواب"، یعنی حضور اکرم ﷺ جو کچھ خواب میں دیکھتے فوراً ہی یا کچھ دنوں کے بعد کوئی واقعہ اس کے مطابق پیش آجاتا۔ صحیح بخاری میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ "سچا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے"۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ "شروع شروع میں رسول اللہ ﷺ پر وحی رویائے صادقہ کی شکل میں آتی تھی آپ ﷺ جو کچھ خواب میں دیکھتے تھے وہ صبح کے

تڑکے کی طرح صحیح نکلتا تھا۔

۲۔فرشتہ کا پیغام الٰہی کو قلب میں اتار دینا

اس طریقہ میں فرشتہ وحی نظر نہیں آتا اور پیغام آپ ﷺ کے دل میں اتار دیتا جیسا کہ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ ''روح القدس (جبرئیل علیہ السلام) نے میرے دل میں یہ بات ڈالی کہ کوئی نفس اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک کہ وہ اپنے رزق کی تکمیل نہ کر لے۔ بس تم اللہ سے ڈرو اور طلب رزق میں خوش روش سے کام لو اور خبردار رہو کہ کہیں رزق کا متاخر ہو جانا تم کو اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ اللہ کی نافرمانی کی راہ سے اس رزق کو طلب کرو کیونکہ اللہ کے پاس جو کچھ ہے وہ اس کی اطاعت اور بندگی سے حاصل ہو سکتا ہے۔''

۳۔گھنٹہ کی آواز کی طرح (صلصلۃ الجرس)

اس طریقہ سے مراد یہ ہے کہ وحی گھنٹہ کی آواز کی طرح آتی تھی۔اس صورت میں حضور اکرم ﷺ محض اس آواز کو سن سکتے تھے بولنے والا نظر نہیں آتا تھا۔صحیح بخاری میں ہے کہ حارث بن ہشامؓ نے ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ سے معلوم کیا کہ ''یارسول اللہ ﷺ آپ ﷺ پر وحی کس طرح نازل ہوتی ہے'' آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''کبھی کبھی وحی میرے پاس گھنٹہ کی آواز کی طرح آتی ہے اور یہ میرے اوپر سخت ترین ہوتی ہے، اور جب یہ مجھ سے منقطع ہوتی ہے تو فرشتہ جو کچھ مجھ سے کہتا ہے وہ سب مجھ کو یاد ہو جاتا ہے''

۴۔فرشتہ وحی کا انسانی شکل میں آنا (تمثیل)

فرشتہ وحی کسی انسان کی شکل میں آتا تھا اور وہ آپ ﷺ سے خطاب کرتا تھا، یہاں تک کہ آپ ﷺ کو پوری بات یاد ہو جاتی تھی۔

ایک مرتبہ جبرئیلؑ سب سے خوبصورت صحابی حضرت دحیہ الکلبیؓ کی شکل میں آئے اور آپ ﷺ سے سوالات کئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ جبرئیل علیہ السلام تھے جو دین سکھانے آئے تھے۔ بخاری شریف کی حدیث ہے کہ "ایک مرتبہ آپ ﷺ کے پاس ام سلمہؓ تشریف فرما تھیں حضرت جبرئیلؑ تشریف لائے اور باتیں کرنے لگے۔ آپ ﷺ نے ان سے سوال کیا کہ یہ کون ہیں تو وہ بولیں یہ تو دحیہ الکلبیؓ ہیں حضرت ام سلمہؓ کا بیان ہے کہ یا خدا میں انھیں دحیہ الکلبی ہی سمجھتی رہی یہاں تک کہ میں نے حضور اکرم ﷺ کا خطبہ سنا جس میں آپ ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے آنے کی خبر دی تب میں سمجھی کی حضرت جبرئیل علیہ السلام حضرت دحیہ الکلبیؓ کی شکل میں آئے تھے۔"

۵۔ فرشتہ وحی کا اصلی شکل میں آنا

فرشتۂ وحی کبھی کبھی اپنی اصلی شکل میں بھی آتا تھا اور رسول اللہ ﷺ کو اللہ کا پیغام پہونچاتا تھا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ "آپ ﷺ نے جبرئیل علیہ السلام کو ان کی اصلی شکل میں دو مرتبہ دیکھا۔ ایک مرتبہ واقعہ معراج کے وقت سدرۃ المنتہیٰ کے پاس۔ اور دوسری مرتبہ مقام اجیاد میں۔"

سورۃ النجم کی درج ذیل آیات انھیں دو واقعات کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

"ان کو بڑی طاقتوں والے اور مضبوط نے تعلیم دی پھر وہ سیدھا ہو گیا اور وہ بہت اوپر آسمان کے کنارے پر تھا۔ پھر وہ قریب ہوا اور لٹک گیا اب فاصلہ دو کمانوں کے برابر یا اس سے بھی کم تھا اور اب خدا نے اپنے بندے پر وحی کی۔ جو کی دل نے جو کچھ دیکھا اسے جھوٹ نہیں کیا تو کیا تم لوگ پیغمبروں سے ان چیزوں پر جھگڑتے ہو جو انھوں نے دیکھی ہیں۔" (سورۃ النجم۔ آیت ۵ تا ۱۲)

۶۔ خدا کا براہ راست کلام کرنا

اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی واسطے کے حضور اکرم ﷺ سے براہ راست کلام کیا جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا تھا۔ یہ طریقہ حضور اکرم ﷺ کے لئے واقعہ معراج سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

''اور کسی بشر کی یہ شان نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام فرمائے مگر یا تو وحی بھیج کر یا حجاب کے پیچھے سے یا کسی فرشتہ کو بھیج کر کہ وہ اللہ کے حکم سے جو اللہ کو منظور ہوتا ہے وحی پہونچا دیتا ہے اور وہ بڑا عالی شان بڑی حکمت والا ہے''۔ (سورۃ الشوریٰ۔ آیت ۵۱)

تاریخ نزول قرآن

قرآن مجید کلام الٰہی ہے۔ جس کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ پر تھوڑا تھوڑا کر کے نازل فرمایا۔ حضور اکرم ﷺ جب چالیس سال کے ہوئے تو غارِ حرا میں جہاں آپ ﷺ جا کر عبادت کیا کرتے تھے پہلی وحی ''سورۃ العلق'' نازل ہوئی۔ پورا قرآن مجید رمضان کے مہینہ میں شب قدر میں لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر نازل کیا گیا۔ پھر تقریباً ۲۳ سال تک بوقت ضرورت تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا رہا۔

''اِنَّا اَنْزَلْنٰہُ فِیْ لَیْلَۃِ الْقَدْرِ'' (سورہ القدر آیت ۔۱)

ترجمہ: ہم نے اس (قرآن) کو شب قدر میں نازل کیا ہے۔

اور جب آپ ﷺ نے مکہ مکرمہ سے قریب میدان عرفات میں قیام فرمایا تو قرآن مجید کی آخری آیت نازل ہوئی۔

''اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا''. (سورۃ المائدہ۔ آیت ۳)

ترجمہ: آج ہم نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کر دیا اور تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کیا۔

قرآن مجید کے نازل ہونے کا زمانہ دو حصوں میں ہے۔ پہلا حصہ جب آپ ﷺ مکہ معظمہ میں مقیم تھے تقریباً ساڑھے بارہ سال کا ہے جس میں ایک سو چودہ سورتوں میں سے تقریباً ۸۵ سورتیں نازل ہوئیں جو مکی سورتیں کہلاتی ہیں۔ اور بقیہ ۲۹ سورتیں ہجرت مدینہ کے بعد مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں اور یہ مدنی سورتیں کہلاتی ہیں۔

☆☆☆

جمع وتدوین قرآن

قرآن مجید کا نزول وقفہ وقفہ سے ہوا ہے جیسا کہ قرآن میں خود اس کی تفصیل موجود ہے کہ زمانہ اور وقت کی ضرورت کے مطابق قرآن مجید تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا رہا۔ قرآن مجید کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تبارک تعالی نے اپنے ذمہ لی ہے۔ نبی کریم ﷺ کا کام یہ تھا کہ وہ قرآن مجید کو جبرئیل امینؑ کی زبانی سنیں اور جس طرح سنیں ویسے خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیمات بتائیں۔

قرآن مجید کے جمع وتدوین کا کام مندرجہ ذیل تین مراحل میں انجام پایا۔

ا۔ عہد رسالت میں جمع قرآن

آپ ﷺ قرآن کی حفاظت اور اس کی ترتیب کے معاملے میں انتہائی محتاط تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنے ابتدائی نزول قرآن کے زمانے میں صحابہ کرامؓ کو قرآن کے علاوہ کچھ بھی لکھنے سے منع فرما دیا تھا تا کہ قرآنِ مجید کے ساتھ حدیث مل نہ جائے اور بعد میں لوگوں کو پریشانی ہو۔ قرآن کے نزول کی ترتیب یہ تھی کہ کبھی پوری سورہ نازل ہوتی اور کبھی ایسا ہوتا کہ ایک سورہ کی کچھ آیات نازل ہوتیں اور پھر بقیہ آیات کافی دنوں کے بعد نازل ہوتیں۔ لہذا حضرت عثمانؓ سے روایت ہے کہ:

''نبی کریم ﷺ پر متعدد سورتیں یعنی مختلف سورتوں کی آیتیں نازل ہوتی رہتیں۔

جب ایسی سورہ نازل ہوتی تو آپ ﷺ کچھ کاتبین وحی کو بلاتے اور فرماتے کہ ان آیتوں کو اس سورہ میں رکھو جس میں یہ ذکر ہے۔ پھر کوئی آیت نازل ہوتی تو فرماتے اس آیت کو اس سورہ میں رکھو جس میں یہ یہ باتیں بیان ہوئی ہیں''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جس ترتیب سے سنا اس کے مطابق آپ ﷺ نے کاتبین وحی کو لکھنے کا حکم دیا۔ گویا پورا کا پورا قرآن آپ ﷺ کی زندگی ہی میں مرتب و مدون ہو چکا تھا۔ قرآن مجید کی کتابت کے لیے باریک جھلی، پتلا چمڑا، کھجور کی شاخوں کا نچلا حصہ اور اونٹ کے شانے کی چوڑی ہڈی وغیرہ چیزیں اس زمانے میں استعمال کی جاتی تھیں۔

دربار رسالت میں باقاعدہ کاتبین وحی متعین تھے چنانچہ مکی دور میں حضرت ابوبکرؓ حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علیؓ اور مدینہ آنے کے بعد ان حضرات کے علاوہ حضرت زبیر بن عوامؓ، ابی بن کعبؓ، عبداللہ بن ارقمؓ، امیر معاویہؓ اور زید بن ثابتؓ وغیرہ بعض روایات کے مطابق بیالیس صحابہ کرامؓ اس خدمت پر مامور تھے۔

آپ ﷺ کا معمول تھا کہ جب بھی کوئی وحی آتی تھی تو آپ ﷺ فوراً کسی کاتب وحی کو بلا کر نازل شدہ وحی لکھوالیا کرتے تھے اور اس کے لکھ لینے کے بعد پڑھوا کر سنتے تھے جیسا کہ کاتبینِ وحی کے سرخیل حضرت زید بن ثابتؓ کا بیان ہے۔ اس کے بعد عام اشاعت کا حکم دے دیا جاتا تھا کاتب وحی کتابت سے فارغ ہو کر عام مسلمانوں کو بھی یہ نازل شدہ حصہ پڑھ کر سنا دیتے اور لکھنا جاننے والے اسے خود بھی لکھ لیتے اور بقیہ لوگ اسے زبانی یاد کرنے پر اکتفا کرتے اس طرح ایک طرف تو قرآن کی کتابت رسول پاک ﷺ کی نگرانی میں ہوئی اور دوسری طرف بہت سے صحابہ کرامؓ اسے اپنے طور پر بھی ضبط تحریر لاتے رہے۔ حضرت جبرئیل امینؑ نبی کریم ﷺ کو ہر سال رمضان میں ایک بار قرآن مجید پڑھ کر سنایا کرتے تھے اور جس سال آپ ﷺ نے وفات پائی

اس سال دو بار پڑھ کر سنایا تھا۔

۲۔عہد صدیقی میں جمع قرآن

دوسری مرتبہ جمع قرآن کا کام حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں ہوا۔ چنانچہ بخاری شریف میں روایت ہے کہ ''حضرت زید بن ثابتؓ نے کہا کہ'' مجھے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جنگ یمامہ (جس میں تقریباً ۷۰ حفاظ کرامؓ شہید ہو گئے تھے) کے بعد بلوا بھیجا میں پہونچا تو میں نے دیکھا کہ حضرت عمر بن الخطابؓ ان کے پاس بیٹھے ہیں تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا کہ'' یہ عمرؓ میرے پاس آئے ہیں اور کہتے ہیں کہ جنگ یمامہ میں قرآن کے بہت سے پڑھنے والے شہید ہوئے ہیں اور مجھے خطرہ ہے کہ اگر اسی طرح دوسری جنگوں میں شہید ہوتے رہے تو بہت سارا قرآن ہاتھوں سے جاتا رہے گا لہذا میرا مشورہ ہے کہ آپؓ قرآن مجید کو جمع کرنے کا حکم دیں۔ تو میں نے حضرت عمرؓ کو جواب دیا کہ ہم اس کام کو کس طرح کریں جسے رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا۔ تو حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ خدا کی قسم یہ نہایت ضروری اور اہم کام ہے اور یہ مجھ سے اس معاملے میں اصرار اور بحث کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرے سینے کو اس کام کے لیے کھول دیا اور میری بھی وہی رائے ہوگئی جو حضرت عمرؓ کی تھی۔ پھر حضرت زید بن ثابتؓ کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم جوان اور عقل مند ہو ہم تم پر کسی طرح کی تہمت نہیں لگا سکتے۔ نیز تم رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں وحی کی کتابت بھی کیا کرتے تھے لہذا تم پورے قرآن کو یکجا کرنے میں لگ جاؤ۔ خدا کی قسم اگر وہ مجھے پہاڑ کو ہٹانے کی زحمت دیتے تو مجھ پر گراں نہ گذرتا جتنا جمع قرآن کی اس ذمہ داری کا بوجھ جس کا انہوں نے مجھے حکم دیا۔ غرض میں نے کہا کہ آپؓ دونوں کس طرح وہ کرنا چاہتے ہیں جسے رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا۔ تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا

کہ خدا کی قسم یہی بہتر ہے۔ بس حضرت ابو بکرؓ مجھ سے اصرار و بحث کرتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرے سینے کو اس کام کے لیے کھول دیا جس کے لیے اس نے حضرت ابو بکر و حضرت عمرؓ کے سینے کو کھول دیا تھا۔ چنانچہ میں قرآن مجید کو کھجور کی چھالوں، پتھر کی تختیوں اور لوگوں کے سینوں سے جمع کرتا رہا البتہ سورۃ توبہ کا آخری حصہ لکھا ہوا مجھے صرف حضرت ابو خزیمہ انصاریؓ کے پاس ملا اور کسی کے پاس سے وہ مجھے نہ ملا یعنی "لَقَدْ جَاءَ کُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ" ختم سورۃ براۃ تک (پس اس کو حضرت ابو خزیمہؓ سے لے کر مصحف میں لکھا گیا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ان کی گواہی کو دو لوگوں کی گواہی کے برابر قرار دیا تھا جب کہ دوسرے لوگوں کو دو گواہ پیش کرنے ہوتے تھے تب ان کے پاس لکھے ہوئے قرآن کے حصہ کو قرآن مجید میں شامل کیا جاتا تھا) پس یہ صحیفہ حضرت ابو بکرؓ کے پاس ان کی وفات تک رہا پھر حضرت عمرؓ کے پاس ان کی وفات تک رہا اور پھر حضرت حفصہ بنت عمرؓ کے پاس رہا۔

۳۔عہد عثمانی میں تدوین قرآن

قرآن کریم قریش کی زبان عربی میں حضور اکرم ﷺ پر نازل ہوا۔ عرب میں زبان کے اعتبار سے سات قبائل فصیح سمجھے جاتے تھے جن کی زبان تو عربی تھی لیکن ان کے لہجوں میں فرق تھا، قرآن کریم کے بعض بعض الفاظ کو ان ساتوں لہجوں میں پڑھا جاسکتا تھا۔ چنانچہ ان لہجوں کے طرز ادا و بیان میں اختلاف کے باوجود ان میں قرآن پڑھنے کو صحیح قرار دیا گیا۔

ایک بار حضرت حذیفہ بن یمانؓ جو آرمیبیا اور آذربائیجان کے محاذ پر جہاد میں شامل تھے ان کے ساتھ عراق اور شام کے لوگ بھی تھے جو قرآن کریم کی تلاوت الگ الگ طریقے سے کرتے تھے لہذا ان علاقوں کے لوگوں کی قرأت میں اختلاف دیکھ کر وہ

حضرت عثمانؓ کے پاس آئے اور فرمایا کہ ''قبل اس کے کہ امت کتاب الٰہی میں یہود و نصاریٰ کی طرح اختلاف کرنے لگے اس کی طرف توجہ کیجئے۔'' تو حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ سے حضرت ابوبکرؓ کا جمع کردہ صحیفہ منگوایا اور اس کے مطابق حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور حضرت حارث بن شہابؓ وغیرہ کو یہ کام سونپا کہ وہ اس صحیفہ کی نقل کر کے قرآن مجید کو کتابی شکل میں مدون کردیں اور اس کو قریش کی زبان والے لہجہ کے مطابق لکھنے کا حکم دیا۔ کیونکہ قرآن مجید انھیں کی زبان میں نازل ہوا تھا۔ پھر کاپیاں کرا کر پورے ملک میں بھجوادیں اور فرمایا اس کے مطابق قرآن پڑھا جائے گا اور بقیہ صحیفوں کو تلف (ختم) کروادیا تاکہ اختلافات باقی نہ رہیں اس طرح حضرت عثمانؓ نے اپنی دوراندیشی سے اختلافات کا خاتمہ کردیا۔ اسی وجہ سے حضرت عثمانؓ کو جامع قرآن کہا جاتا ہے۔

عہد اموی میں اعراب کا لگنا

عربوں کو عربی زبان کے قرآن کو پڑھنے کے لیے اس پر زیر زبر اور پیش وغیرہ لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ لیکن عہد بنوامیہ میں خلیفہ عبدالملک کے زمانہ میں والی عراق حجاج بن یوسف کو جب یہ معلوم ہوا کہ مفتوحہ ممالک میں غیر عرب قرآن مجید کو پڑھنے میں غلطی کرتے ہیں جس سے اختلافات بڑھ رہے ہیں چونکہ یہ دور فتوحات کا دور تھا اور اسلامی دنیا وسیع ہو رہی تھی اور مختلف قومیں اسلام میں داخل ہو رہی تھی تو حجاج بن یوسف نے قرآن مجید میں اعراب (زیر۔ زبر۔ پیش اور جزم وغیرہ) لگوائے اور اس کو تیس پاروں میں تقسیم کرادیا اس سے غیر عربوں کو قرآن مجید پڑھنے اور اس کے تلفظ میں آسانی ہوگئی جو امت کے لیے عظیم خدمت تھی۔

☆☆☆

تفسیر

ضرورت، اہمیت اور اس کا ارتقاء

تفسیر کے معنی

یہ لفظ فسر سے بنا ہے جس کے معنی ظاہر کرنا، کھول کر بیان کرنا اور بے حجاب کرنا ہیں۔ اسلامی اصطلاح میں:

''تفسیر ایک ایسا علم ہے جس کی مدد سے نبی کریم ﷺ پر نازل شدہ قرآن کے معانی سمجھے جاتے اور اس کے احکام و مسائل اور اسرار و حکم سے بحث کی جاتی ہے۔''

گویا تفسیر ایک ایسا علم ہے جس میں انسان کی استطاعت کے مطابق اللہ تعالیٰ کی مراد اور مرضی کو واضح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اس میں ہر وہ علم شامل ہے جس کے ذریعہ مراد خداوندی کو سمجھنا آسان ہو۔

تفسیر کی اہمیت

قرآن کریم ۲۳ سال کی مدت میں حضور اکرم ﷺ پر ضرورت اور وقت کے مطابق نازل ہوا۔ چونکہ اس کے سب سے پہلے مخاطب قریش تھے۔ اس لیے یہ عربی زبان میں نازل ہوا۔ لہذا انہوں نے بغیر پریشانی کے قرآن مجید کو آسانی سے سمجھ لیا۔

البتہ اگر کوئی آیت یا حکم سمجھ میں نہیں آتا تو حضور اکرم ﷺ کی ذات اقدس سے معلوم کر لیتے کیونکہ نبی کریم ﷺ کی بعثت کے بہت سے مقاصد میں سے ایک اہم ترین مقصد یہ بھی تھا کہ وہ کتاب اللہ کی تعلیم دیں۔ جیسا کہ اللہ تعالی فرماتا ہے:

''وہی ہے وہ ذات جس نے بغیر پڑھے لکھے لوگوں میں سے ہی رسول بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے۔ ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب (قرآن) وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اور وہ لوگ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا تھے''۔ (سورہ جمعہ۔ آیت ۲)

رسول اکرم ﷺ نے اپنے قول وعمل سے ان آیات کو نہ صرف سمجھایا بلکہ عملی طور پر اس کا نمونہ پیش کیا لہذا حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ: ''حضور اکرم ﷺ کی زندگی قرآن کی عملی تفسیر تھی''۔ (مسند احمد، حدیث-۲۴۴۶۰)

اس کے علاوہ صحابہ کرامؓ کو جب بھی کوئی مسئلہ درپیش آتا تو وہ رسول اللہ ﷺ سے معلوم کر لیتے لیکن جب اسلام کا دائرہ وسیع ہوا اور اقوام عالم اسلام میں داخل ہوئیں جو عربی زبان وادب سے ناواقف تھیں تو ان کے لیے صحابہ کرامؓ نے اپنی ذمہ داری کو بحسن وخوبی ادا کیا اور انھیں قرآن وحدیث کے متعلق تفصیلی معلومات فراہم کیں اور مشکل مسائل میں ان کی تشریح اور وضاحت کی۔ اس طرح تفسیر کا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ یاد دہانی اور عبرت حاصل ہوتی ہے اور ساتھ ہی عقائد، عبادات و معاملات اور اخلاق کے شعبوں میں خدا تعالی کی ہدایت معلوم ہوتی ہے تا کہ اس پر عمل کر کے فرد اور معاشرہ، دنیا و آخرت میں کامیابی و کامرانی حاصل کر سکے نیز قرآن کے احکامات پر عمل اسی وقت ممکن ہے جب ہم قرآن مجید کے معانی اور مطلب کو سمجھیں اور یہ علم تفسیر کے ذریعہ ممکن ہے۔

تفسیر کی ضرورت

قرآن مجید سارے انسانوں کی بھلائی کے لیے اتارا گیا ہے اور وہ ایک مکمل زندگی گزارنے کا قانون اور ہدایت کا طریقہ ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسے نصیحت حاصل کرنے والوں کے لیے نہایت آسان بنایا ہے۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ. (سورۃ القمر، آیت: ۱۷)

''اور ہم نے سمجھنے والوں کے لیے قرآن کو آسان کر دیا ہے، پھر ہے کوئی غور وفکر کرنے والا۔''

قرآن مجید قریش کی زبان عربی میں نازل ہوا جو اس کے سب سے پہلے مخاطب تھے اور عربوں کو اپنی زبان و ادب اور فصاحت و بلاغت پر بہت ناز تھا، چنانچہ ان لوگوں کو قرآن مجید کے سمجھنے اور خدا کی مرضی کو جاننے میں کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ قرآن مجید اصول و قانون کی کتاب ہے، لہٰذا سارے مسائل کا حل قرآن سے معلوم کرنا ضروری ہے۔ جب عربوں کی فتوحات کی وجہ سے غیر قوموں میں کثرت سے اسلام پھیلنا شروع ہوا جن کے لیے عربی زبان نہ جاننے کی وجہ سے قرآن مجید کی حکمتوں کا سمجھنا بہت مشکل تھا، تو ان کے دلوں میں قرآن مجید کی عظمت بٹھانے کے لیے فضائل قرآن کی تدوین ہوئی اور قرآن پڑھنے کے لیے مصحف پر نقطے اور اعراب لگائے گئے اور لوگوں کو مذہب کے اصولوں اور قانون سے آگاہ کرنے اور قرآن کے علم وحکمت سے متعارف کرانے کے لیے علم تفسیر کی تدوین عمل میں آئی۔

☆☆☆

علم تفسیر کا ارتقاء

پہلا دور: عہد رسالت ﷺ

قرآن کریم عربی زبان میں نازل ہوا تھا لہذا اس وقت کے لوگوں کو قرآن کے معانی ومفہوم کو سمجھنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی تھی کیونکہ ان کی مادری زبان عربی تھی۔ لیکن جہاں کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی تو صحابہ کرامؓ اس وقت رسول اللہ ﷺ سے معلوم کرلیا کرتے۔ رسول اکرم ﷺ قرآن کے مفسر بھی تھے اور آپ ﷺ کی زندگی قرآن کی عملی تفسیر تھی اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ پر قرآن کے نازل کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے معانی ومفہوم کو سمجھانے کی ذمہ داری بھی ڈالی تھی۔ چنانچہ سورۃ النحل آیت ۴۴ میں ارشاد ہے۔

"وَاَنزَلْنَا اِلَیکَ الذِّکرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیهِم"

''اور ہم نے آپ ﷺ پر قرآن نازل کیا تاکہ آپ اسے لوگوں کے لیے واضح کردیں''

رسول اللہ ﷺ نازل شدہ آیات واحکامات کی تشریح کرکے صحابہ کرامؓ کو بتاتے اور اس کے اسباب پر روشنی ڈالتے لہذا حضور اکرم ﷺ کی نگرانی ہی میں صحابہ کرامؓ کا ایک طبقہ مفسر کی حیثیت سے تیار ہونے لگا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تفسیر کا بیش قیمتی سرمایہ اور تفسیری روایات حدیث کی کتابوں میں نقل کی گئی ہیں۔

دوسرا دور: عہد صحابہ

آپ ﷺ کی وفات کے بعد فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا اور تمدن میں بھی وسعت آئی تو دینی احکام میں نئی نئی صورتیں سامنے آنے سے قرآن کریم کی آیات اور احکامات پر غور وفکر کرنا پڑا۔ لیکن صحابہ کرامؓ وہی تفسیر کرتے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ رسول اللہ ﷺ سے سنیں تھیں۔ صحابہ کرامؓ میں دس حضرات اس علم میں مہارت رکھتے تھے۔ یہ خلفائے راشدین، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ ابن مسعودؓ، ابی بن کعبؓ، زید بن ثابتؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ ہیں۔ ان کے علاوہ حضرت انس بن مالکؓ، ابوہریرہؓ، عبد اللہ بن عمرؓ، جابر بن عبد اللہؓ، عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ ہیں۔ سب سے زیادہ جن سے تفسیری روایات منقول ہیں وہ صرف چار ہیں۔ حضرت علیؓ، عبداللہ ابن عباسؓ، عبداللہ ابن مسعودؓ، ابی بن کعبؓ۔

اس دور میں تفسیر کے لیے چار ماخذ استعمال ہوتے تھے۔

۱۔ قرآن کریم	۲۔ حدیث نبوی ﷺ
۳۔ اجتہاد	۴۔ یہود ونصاریٰ

اس دور کی تفسیری خصوصیات

۱۔ پورے قرآن کی تفسیر نہیں بیان کی گئی تھی صرف مشکل چیزوں کی تفسیر بیان کی جاتی تھی۔

۲۔ قرآن کے معانی ومطالب میں صحابہ کرامؓ میں اختلاف بہت کم تھا۔

۳۔ صحابہ کرامؓ صرف قرآن مجید کے اجمالی معنی پر ہی اکتفا کرتے تھے اور تفصیلات کی تلاش کو غیر ضروری سمجھتے تھے۔

۴۔ مختصر الفاظ میں لغوی معنی کی تشریح کو کافی سمجھتے تھے۔

۵۔ صحابہ کرامؓ کے عہد میں تفسیر کی تدوین نہیں ہوئی تھی اس کا آغاز دوسری صدی ہجری میں ہوا۔ لیکن کچھ صحابہ نے اپنے مصحف پر تفسیری الفاظ لکھ لیے تھے۔

۶۔ اس عہد میں تفسیر کی کوئی علاحدہ صورت نہیں تھی۔ بلکہ تفسیری اقوال احادیث کا حصہ سمجھے جاتے تھے اور حدیث کی طرح الگ الگ آیات کی تفسیر بلا ترتیب الگ بیان کی جاتی تھی۔

تیسرا دور: عہد تابعین

عہد خلفائے راشدین میں فتوحات کی وجہ سے جہاں جہاں اسلام کی روشنی پھیلی مسلمانوں نے وہاں رہائش اختیار کر لی اور اپنے علم سے لوگوں کو فائدہ پہونچانا شروع کیا۔ لہذا ان علاقوں میں صحابہ نے مدارس قائم کیے جن سے تابعین نے استفادہ کیا اور اپنی محنت اور جد وجہد سے علم کے پھیلانے کا حق ادا کر دیا اور رفتہ رفتہ تفسیر قرآن کو مکمل کر دیا۔ اس دور کے نامور مفسرین میں۔ مجاہد، عطاء بن ابی رباح، عکرمہ، سعید بن جبیر حسن بصری، ابو العالیہ، ضحاک اور قتادہ وغیرہ ہیں۔ سب سے پہلے اموی خلیفہ عبد الملک بن مروان نے سعید بن جبیر سے تفسیر لکھوا کر اس فن کا آغاز کیا۔

اس دور کے مشہور تفسیری مراکز تین تھے

۱۔ مکہ: ۔ اس کا تفسیری مکتب حضرت ابن عباسؓ نے قائم کیا تھا آپ اپنے تابعین تلامذہ کے درمیان درسِ قرآن دیتے اور اس کی مشکل چیزوں کو حل کرتے۔ اس مکتب کے مشہور شاگرد سعید بن جبیر، مجاہد، عکرمہ، طاؤس بن کیسان، عطاء بن ابی رباح ہیں۔

۲۔ مدینہ: ۔ اس مدرسہ کی تشکیل حضرت ابی بن کعبؓ کے ذریعہ ہوئی تھی۔

مدینہ میں رہتے ہوئے وہ اپنے ساتھیوں کو قرآن وسنت کا درس دیا کرتے تھے۔ زیادہ تر تفسیری اقوال آپؓ ہی سے مشہور ہیں۔ اس مدرسہ کے مشہور تابعی شاگردوں میں۔ ابوالعالیہ، محمد بن کعب القرظی، زید بن اسلم ہیں۔

۳۔ کوفہ:۔ مکتب تفسیر کے پہلے استاد عبداللہ بن مسعودؓ تھے جنہوں نے رائے کے استعمال کی بنیاد ڈالی اسی وجہ سے اہل عراق کو اہل الرائے کہا جاتا ہے، ان کے مشہور شاگردوں میں علقمہ بن قیس، مسروق، اسود بن یزید، مرہ ہمدانی، عامر شعبی، حسن بصری اور قتادہ ہیں۔

اس دور کے تفسیری مصادر درج ذیل تھے:

۱۔ قرآنی آیات ۲۔ احادیث ۳۔ صحابہ کرامؓ کے تفسیری اقوال

۴۔ اہل کتاب اوران کی آسمانی کتابیں ۵۔ تابعین کا اجتہاد واستنباط۔

اس دور کی تفسیری خصوصیات

۱۔ اس دور میں اسرائیلی اور نصرانی روایات شامل ہوگئیں کیونکہ اہل کتاب نے اسلام قبول کیا جس کی وجہ سے ان کی نقل کردہ روایات پھیل گئیں مثلاً آغاز تخلیق، کائنات کا قیام اور دنیا کے وجود سے متعلق قصے اور کہانیاں وغیرہ۔

۲۔ ہر شہر کے رہنے والے اپنے علاقے کے عالم اور امام کے قول کو ترجیح دیتے جس کی وجہ سے اختلافات بڑھنے لگے مثلاً مکہ کے لوگ ابن عباسؓ، مدنی ابی بن کعبؓ اور عراقی عبداللہ بن مسعودؓ کے تفسیری اقوال نقل کرتے تھے۔

۳۔ اس دور میں مذہبی اختلافات شروع ہوگئے جس کے اثرات تفسیری اقوال پر بھی پڑے۔

چوتھا دور: عہد اموی

اس دور میں علماء گھوم گھوم کر احادیث جمع کرتے اور ان سے تفسیری روایات نقل کرتے تھے لیکن اس دور میں تفسیر حدیث نبوی ﷺ سے الگ ہو کر ایک الگ فن کی صورت اختیار کر گئی۔ اب قرآن کی ترتیب کے مطابق ہر آیت کی تفسیر الگ الگ کی جانے لگی اس میں مندرجہ ذیل علماء نے حصہ لیا۔ ابن ماجہ، ابن جریر طبری، ابی حاتم امام حاکم اور دیگر مفسرین و محدثین وغیرہ۔ اس دور میں بھی تفسیر بہر حال تفسیر ماثور ہی باقی رہی صرف فرق یہ پڑا کہ روایات کے بیان میں اسناد کا ذکر بہت کم ہوتا تھا اور بہت سی تفسیری تصانیف تیار ہونے لگیں۔

اس دور کی تفسیری خصوصیات

۱۔ روایات کرنے والوں کے نام بیان نہیں کئے جاتے تھے۔
۲۔ حدیثیں اور روایتیں گھڑی جانے لگیں۔
۳۔ صحیح اور غلط اقوال میں فرق نہیں رہا۔
۴۔ اسرائیلیات اور موضوع روایات کا بلا جھجک استعمال ہونے لگا۔
۵۔ تفسیر منقول میں ذاتی رائے اور خیالات داخل ہونے لگے۔

پانچواں دور: عصر تدوین کے بعد سے عصر حاضر تک

یہ دور تفسیر کا طویل ترین تاریخی دور ہے۔ جو عباسی خلافت سے شروع ہو کر عصر حاضر تک پھیلا ہوا ہے۔ اس دور کے مندرجہ ذیل حالات تفسیر پر اثر انداز ہوئے۔

۱۔ اس دور میں عقلی دلائل اور نقلی روایات کی ملاوٹ شروع ہوگئی۔
۲۔ عربی زبان و قواعد سے متعلق علوم مرتب ہوئے۔
۳۔ فقہی مسلکوں کا قیام ہوا اور علم کلام کی شروعات ہوئی۔
۴۔ گروہی تعصب اور فرقہ پرستی کا آغاز ہوا۔

۵۔ منطق وفلسفہ سے متعلق کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوا۔

علم تفسیر کا یہ ارتقائی عمل رفتہ رفتہ جاری رہا اور تفسیر کی کتابیں مختلف رجحانات اور خیالات کا مرکز بن گئیں۔

۱۔ تفسیر کے سلسلے میں علمی اصطلاحات تیار ہوئیں۔

۲۔ علم تفسیر میں وسعت پیدا ہوئی۔

۳۔ قرآن مجید کے مختلف پہلوؤں جیسے ادبی، فقہی، لغوی، نحوی وغیرہ پر الگ الگ تفاسیر لکھی گئیں۔

۴۔ قرآنی عبارتوں سے مذہبی عقائد کو ثابت کیا جانے لگا۔

۵۔ مختلف علوم کے مطابق تفسیر لکھی جانے لگی خاص کر تفسیر پر عقلی علوم کا غلبہ ہو گیا۔

۶۔ تفسیر قرآن کی آڑ میں مسلمانوں کے سامنے فلسفیانہ تہذیب وثقافت کو عام کیا گیا۔

۷۔ تفسیر میں تصوف کے نظریات کی آمیزش ہوئی۔

۸۔ باطل مذاہب کے گمراہ عقائد وخیالات نے بھی تفسیر کی کتابوں میں جگہ پالی۔

تفسیر کی حیثیت

اس دور میں تفسیر کی حیثیت یہ ہو گئی تھی کہ جو شخص کسی بھی علم وفن میں ماہر ہوتا تھا اس کی تفسیر اسی علم تک محدود رہ گئی۔ چنانچہ زجاج، واحدی اور ابوحیان نے اپنی تفسیر میں صرف اور نحو کی بحث کا مظاہرہ کیا۔ جو لوگ عقلی علوم میں ماہر تھے انہوں نے اپنی تفسیر کو حکماء وفلسفیوں کے اقوال کا مجموعہ بنا دیا مثلاً امام فخر الدین رازی۔ فقہاء نے صرف فقہی مسائل ودلائل کا ذکر کیا مثلاً جصاص اور قرطبی وغیرہ۔ اور تاریخ نگاروں نے اپنی تفسیر میں صحیح وغلط ہر طرح کے واقعات اور خبروں کی بھرمار کر دی مثلاً ثعلبی اور خازن وغیرہ۔ اس دور میں فن تفسیر کا استعمال اپنے مذہب، مسلک اور فن کے اظہار کے لیے ہونے لگا۔

☆☆☆

چند اہم عربی تفاسیر

جامع البیان فی تفسیر القرآن - امام طبریؒ

تعارف مؤلف: نام محمد بن جریر بن یزید طبری ہے، اور کنیت ابو جعفر ہے آپ کی پیدائش ۲۲۴ھ مطابق ۸۳۹ء میں طبرستان میں ہوئی، علم حاصل کرنے کے لیے بارہ سال کی عمر میں ہی گھر سے نکل گئے اور مختلف علاقوں کے علمی حلقوں کا سفر کیا، مصر، شام، عراق وغیرہ میں علم حاصل کیا اور آخر میں بغداد میں ہی رہائش اختیار کر لی حتی کہ ۳۱۰ھ میں بغداد میں ہی ان کی وفات ہوئی۔

آپ حافظ قرآن، محدث، مفسر اور مجتہد تھے ابن جریر کے علم وفضل کے متعلق خطیب بغدادی فرماتے ہیں کہ ''ابن جریر علم وفضل میں بے مثال تھے۔ آپ کے دور میں کوئی شخص آپ کے برابر نہ تھا آپ قرآن کریم کے حافظ ومفسر، احکام قرآن کے ماہر اور عظیم محدث کے ساتھ ساتھ تاریخی واقعات کے زبردست عالم تھے۔

امام سیوطی فرماتے ہیں کہ ''ابن جریر پہلے شافعی مسلک کے تھے پھر ایک الگ اپنا مسلک قائم کیا۔ لوگ آپ کی اتباع کرتے تھے اور آپ نے فقہی مسائل پر بہت سی کتابیں لکھیں'' آپ کی کتابوں میں اس وقت صرف ایک تفسیر اور ایک تاریخ پر ملتی ہے اور ان ہی دو کتابوں نے انہیں علم تفسیر اور علم تاریخ کا بانی قرار دے دیا۔

(۱) تفسیر القرآن (۲) تاریخ الأمم والملوک

تعارف تفسیر: ابن جریر کی تفسیر مشہور ترین تفسیر ہے جو تیں ضخیم جلدوں میں دس ہزار اوراق پر مشتمل اپنے شاگردوں کے ذریعہ سات سالوں میں تیار کرائی گئی۔ علماء کرام کے نزدیک یہ سب سے بہتر تفسیر ہے اور مفسرین کے نزدیک منقولی تفسیروں میں اس کو اول ماخذ و مصدر کی حیثیت حاصل ہے۔ اس میں رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ و تابعین کے اقوال سند کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ ناسخ و منسوخ کا احاطہ کیا گیا ہے اور احکام شرعیہ کا استنباط آیات قرآن سے کیا گیا ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ ''اس بات پر پوری امت کا اتفاق ہے کہ تفسیر ابن جریر جیسی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔''

امام جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ ''تفسیر ابن جریر تمام کتب تفسیر سے افضل ہے اس میں تفسیری اقوال کی توجیہ و ترجیح، قواعد و نحو وغیرہ مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ اس طرح یہ تفسیر سابقہ کتب تفسیر پر فوقیت رکھتی ہے۔''

تفسیر ابن جریر کے بارے میں علماء کے خیالات کے پیش نظر یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اس کی ضرورت و اہمیت کی بناء پر اور تفسیر قرآن کے عظیم مآخذ ہونے کی وجہ سے کوئی مفسر اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا ہے۔

تفسیر کی خصوصیات

(۱) تفسیر بالرائے کرنے والوں پر اعتراض کرتے ہیں اور صحابہ و تابعین کے اقوال سے استفادہ کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔

(۲) اپنی تفسیر میں روایات کو اسناد کے ساتھ ذکر کیا ہے لیکن اسناد کی جانچ نہیں کرتے یہ ذمہ داری پڑھنے والوں کے اوپر چھوڑ دیتے ہیں۔

(۳) تفسیر قرآن کے سلسلہ میں ابن جریر اجماع امت کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

(۴) وجوہ اعراب سے بحث کی گئی ہے۔

(۵) ناسخ ومنسوخ کا احاطہ کیا گیا ہے۔

(۶) اسرائیلی روایات کا بہت زیادہ ذکر کیا گیا ہے اگرچہ روایات کی جانچ پڑتال کرتے ہوئے انھوں نے روایات کی سند بیان کی ہیں۔

(۷) یہ تفسیر کرتے وقت بے مقصد باتوں سے بچتے ہیں اور بے کار چیزوں کا تذکرہ نہیں کرتے۔

(۸) تفسیر ماثور کے ساتھ ساتھ لغت، عربی زبان، اور دور جاہلیت کی شاعری سے بھی استشہاد کرتے ہیں۔

(۹) اپنی تفسیر میں موقع کے لحاظ سے نحوی ولغوی مباحث کا بھی سہارا لیتے ہیں۔

(۱۰) اپنی تفسیر میں علماء وفقہا کے مذاہب ومسالک کا ذکر کرتے ہیں پھر اپنی رائے دے کر اس کی تائید وحمایت میں علمی دلائل پیش کرتے ہیں۔

(۱۱) اکثر آیات کی تفسیر کرتے وقت علم الکلام کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور معتزلہ کے عقائد کی مخالفت کی ہے اور اہل سنت کے مسلک کی پیروی کی ہے۔

☆☆☆

مفاتیح الغیب-امام رازیؒ

تعارف مؤلف: نام محمد بن عمر بن الحسین ہے، کنیت ابو عبداللہ، نسبت رازی اور لقب فخر الدین ہے ابن الخطیب شافعی کے نام سے مشہور ہوئے آپ ۵۴۴ھ میں طبرستان میں رے کے مقام میں پیدا ہوئے۔ یہ تقریباً سارے علوم یعنی علم تفسیر، علم کلام علوم عقلیہ اور علم لغت کے امام تھے۔ دور دراز سے طلباء آکر آپ سے استفادہ کرتے انھوں نے اپنے والد ضیاء الدین کمال سمعانی اور متعدد دوسرے علماء سے استفادہ کیا۔ آپ بہترین واعظ، عربی وفارسی کے خطیب اور فلسفہ وعلم کلام کے امام تھے۔

ان کے بارے میں امام ابن کثیر لکھتے ہیں ''فخر الدین رازی کی تقریباً دوسو کتابیں ہیں۔ آپ نے ایک کتاب امام شافعی کے حالات پر بھی لکھی۔ بادشاہوں اور حکمرانوں کے یہاں آپ کی بہت عزت تھی۔ آپ کی مجلس میں بادشاہ، علماء، امراء وفقراء اور عوام شریک ہوتے تھے، مختلف شہروں میں آپ نے مدارس کھولے'' آپ کا خاندان علمی تھا خود آپ کے والد امام ضیاء الدین رے کے مشہور خطیب تھے اور انھوں نے فقہ وعلم کلام پر بہت سی کتابیں لکھیں۔ امام رازی نے اپنی کتابون اور تفسیر میں اپنے والد کا ذکر بڑی عقیدت ومحبت سے کیا ہے۔ امام رازی نے زندگی بھر تصنیف کا کام کیا اور فارسی وعربی دونوں زبانوں میں کتابیں لکھیں۔ ان کی مشہور کتابون میں تفسیر کبیر، کتاب البیان

والبرہان، المطالب العالیہ وغیرہ شامل ہیں۔

۶۰۲ھ میں ۶۲ سال کی عمر میں مقام ہرات میں امام رازی کا انتقال ہوا اور ان کو شہر رے میں دفن کیا گیا۔ وفات کی وجہ فرقہ کرامیہ کا زہر دینا بتایا جاتا ہے۔

تعارف تفسیر: ابن خلکان کہتے ہیں کہ امام رازی اس تفسیر کو مکمل نہ کر سکے البتہ تفسیر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تفسیر کا ایک بڑا حصہ خود انھوں نے ہی لکھا ہے اور بقیہ حصہ شیخ نجم الدین احمد بن محمد ۷۲۷ھ اور شیخ شہاب الدین الدمشقی ۶۳۹ھ نے مکمل کیا۔

تفسیر کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ امام رازی نے اس کو سورہ انبیاء تک لکھا تھا لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ پڑھنے والا ہرگز یہ محسوس نہیں کرتا کہ یہ ایک شخص کی تصنیف ہے یا اس کے لکھنے والے ایک سے زائد ہیں، پوری کتاب میں حیرت انگیز یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اس میں ٹھوس علمی مباحث جو مختلف علوم وفنون سے متعلق ہیں نے اس کو حد درجہ شہرت ومقبولیت بخشی ہے۔

ابن خلکان لکھتے ہیں کہ ''امام رازی نے اس تفسیر میں انوکھی بات جمع کر دی ہے''

امام رازی نے اپنی تفسیر سفر وقیام دونوں حالتوں میں لکھی ہے اور ان کی تفسیر کے مطالعہ سے ان کے ذاتی حالات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

تفسیر کی خصوصیات

(۱) امام رازی نے اپنی تفسیر میں آیتوں میں باہمی ربط اور ایک سورہ کی دوسری کے ساتھ آپسی تعلق کا خیال رکھا ہے۔

(۲) ریاضی، علوم طبعی اور دوسرے جدید علوم کا اکثر ذکر کرتے ہیں اور فلاسفہ کے اقوال بیان کر کے ان پر سخت تنقید کرتے ہیں اگر چہ کبھی کبھی خود عقلی استدلال کرتے ہیں مگر ان کا مسلک اہل سنت کا ہی ہوتا ہے۔

(۳) اہل سنت کے پیرو ہونے کی وجہ سے معتزلہ کے اقوال کا ذکر کر کے ان پر سخت جرح کرتے ہیں اس لیے ان پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ مخالفین کے اعتراضات تو نقل کرتے ہیں لیکن ان کا تسلی بخش جواب نہیں دیتے۔

(۴) آپ احکام سے متعلق آیات کی تفسیر کرتے وقت فقہاء کے مذاہب بیان کرتے ہیں اور امام شافعی کے مسلک کی حمایت میں دلائل پیش کرتے ہیں۔

(۵) ان کی تفسیر میں وہ تمام باتیں جمع کردی گئی ہیں جو ان سے پہلے تھیں مثلاً نحو و صرف، ادب، منطق و فلسفہ وغیرہ اور ساتھ ہی اپنی رائے بھی نقل کرتے ہیں۔

امام رازی کی تفسیر تمام علوم کی انسائیکلو پیڈیا معلوم ہوتی ہے۔ جس نے اس کی تفسیری اہمیت کو بڑی حد تک کم کر دیا ہے۔

حاجی خلیفہ لکھتے ہیں کہ ''امام رازی نے اپنی تفسیر کو حکماء و فلاسفہ کے اقوال کا پلندہ بنا دیا ہے اور وہ تفسیر سے اس قدر دور نکل گئے ہیں کہ پڑھنے والا اس کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔

ابوحیان لکھتے ہیں کہ ''امام رازی نے اپنی تفسیر میں بے شمار غیر ضروری باتوں کو یکجا کردیا ہے اس لیے بعض علماء نے کہا ہے کہ تفسیر کبیر میں تفسیر کے علاوہ سب کچھ ہے''

حالانکہ یہ کہنا صحیح نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ امام رازی اپنی تفسیر کو معلومات کا خزانہ بنانا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے پہلے جو باتیں آچکی تھیں ان سبھی کو اپنی تفسیر میں جمع کردیا ہے۔ خصوصاً اس دور میں جب کہ فلسفہ کا رواج ہو اور دین میں شکوک و شبہات پیدا کئے جارہے ہوں اس انداز کا تفسیری کارنامہ یقیناً قابل فخر ہے۔

☆☆☆

الکشاف عن حقائق التنزیل-امام زمخشری رح

تعارف مؤلف: نام محمود بن عمر ہے کنیت ابوالقاسم ،اور نسبت خوارزمی، حنفی، معتزلی ہے۔ چونکہ مکہ میں کافی دنوں تک ان کا قیام رہا ہے اس لیے جار اللہ (اللہ کا پڑوسی) کے لقب سے مشہور ہوئے۔ ۴۶۷ھ مطابق ۱۰۷۵ء کو خوارزم کے گاؤں زمخشر میں پیدا ہوئے۔ سیر وسیاحت اور تعلیم حاصل کرنے کے لیے بغداد اور خراسان کا سفر کیا اور بڑے بڑے علماء کرام سے استفادہ کیا یہ جہاں بھی جاتے لوگ بڑی تعداد میں ان سے استفادہ کرتے اور جس سے بھی مناظرہ و مباحثہ ہوتا وہ ان کے علم وفضل کا قائل ہو جاتا۔ آپ کو اپنے عہد کا عالم وامام کہا جاتا ہے کیونکہ آپ کو تفسیر حدیث، نحو، لغت اور ادب میں اہم مقام حاصل تھا۔ آپ معتزلی عقائد رکھتے تھے اور برملہ اس کا اظہار بھی کرتے تھے۔

ابن خلکان لکھتے ہیں کہ ''زمخشری معتزلی تھے اور اپنے عقائد کا برملا اظہار کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جب وہ کسی دوست سے ملاقات کے لیے جاتے تو اجازت لیتے وقت نوکر سے کہتے اپنے آقاء سے کہئے کہ ابوالقاسم معتزلی ملنے کے لیے آئے ہیں''

آپ کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) المفصل فی النحو (۲) الکشاف عن حقائق التنزیل (۳) روس المسائل فی الفقہ۔

امام زمخشری کی وفات ۵۳۸ھ میں خوارزم کے قریب جرجان میں ہوئی۔

تعارف تفسیر: کشاف میں معتزلی عقائد کی جھلک ملتی ہے البتہ اس میں قرآن حکیم کے معجزہ ہونے کی وجوہات اور قرآنی عبارت اور بلاغت کو نہایت عمدہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ تفسیر دو سال تین ماہ (۱۱۳۲ء تا ۱۱۳۴ء) میں مکمل ہوئی، یہ معتزلی عقائد کی نمائندہ تفسیر ہے۔

اگر معتزلی عقائد کو ہٹا دیا جائے تو ان کی تفسیر میں بڑی خوبیاں ہیں اور اس انداز پر اس پائے کی کوئی دوسری تفسیر نہیں لکھی گئی ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں کہ "علامہ زمخشری کی نظر عموماً قرآنی عبارت پر ہوتی یہ پہلے لغت، اعراب، اور ربط کلام سے بحث کرتے ہیں پھر احتیاط کے ساتھ روایات بھی لاتے ہیں اور لغت واعراب میں عام طور پر صحیح راستہ اختیار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام رازی نے اپنی تفسیر میں ان کی لغوی تحقیق کو جگہ دی ہے جب کہ امام رازی اہل سنت کے پیرو ہیں اور امام زمخشری معتزلی مسلک کے ماننے والے ہیں۔

ہر دور کے علماء اور فقہاء نے کشاف کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے۔ اس کے معتزلی نظریات کو الگ کر کے تحریر کیا ہے اور اس پر حواشی لکھے، احادیث کی تخریج کی اور اس کا خلاصہ تیار کیا ہے اور یہ سب چیزیں اس بات کی دلیل ہیں کہ یہ اعلیٰ درجہ کی تفسیر ہے۔

تفسیر کی خصوصیات

(۱) زمخشری نے قرآن کریم کی بلاغت کو اجاگر کیا ہے جس کی علم تفسیر میں دوسری کوئی مثال نہیں ملتی ہے۔

(۲) قرآن کریم کے کسی لفظ کا مطلب ان کے مسلک کے مطابق نہیں ہوتا ہے تو وہ کوشش کر کے لغت میں سے ہم معنی لفظ تلاش کرتے ہیں اور ظاہری مفہوم کو رد کر دیتے ہیں۔

(۳) اگر کسی لفظ کا حقیقی معنی عجیب نظر آتا ہے تو اس کی جگہ مجازی معنی کا سہارا لیتے ہیں اور ثبوت میں عربی محاورہ یا قدیم شعر پیش کرتے ہیں اور ظاہری معنی قبول کرنے پر اہل سنت کی تنقید کرتے ہیں۔

(۴) یہ آیاتِ قرآنی سے اپنے مذہب و مسلک کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور معتزلی نظریات کی تائید وحمایت میں آیات قرآنی سے دلیلیں دیتے ہیں۔

(۵) زمخشری دوسرے معتزلی کی طرح جادو کے اثر کے بھی منکر ہیں۔

(۶) اپنی تفسیر میں اسرائیلی روایات، بے کار کی باتیں وغیرہ بہت کم بیان کی ہیں اور اگر ذکر بھی کرتے ہیں تو اس کی خامیوں کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔

(۷) فقہی مسائل کا ذکر کم کیا ہے اگرچہ فقہی مسائل میں امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کی پیروی کرتے ہیں مگر تعصب سے کام نہیں لیتے ہیں۔

(۸) بات کو سمجھانے کے لیے سوال و جواب کا طریقہ اختیار کیا گیا۔

دوسرے مفسرین کے برخلاف زمخشری کا دامن اسرائیلی روایات سے پاک نظر آتا ہے مگر یہ خامی نظر آتی ہے کہ ان کی تفسیر میں قرآنی سورتوں کے فضائل بیان کرنے کے سلسلہ میں ضعیف حدیثوں کا سہارا لیا گیا ہے۔ بہر حال امام زمخشری کی تفسیر اپنا ایک اہم مقام رکھتی ہے۔

☆☆☆

ہندوستان میں علم تفسیر

قرآن مجید اللہ تعالی کا آخری پیغام ہے جو آخری رسول حضرت محمد ﷺ کے ذریعہ سے انسانوں تک پہونچا۔ یہ شروع سے آخر تک منشاء الٰہی کا ترجمان اور اس کا ایک ایک لفظ معانی ومفہوم کا گرانقدر خزانہ ہے۔ سارے ہی مسلمان اس کتاب کو اپنے انفرادی واجتماعی مسائل کا حل سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عہد رسالت سے آج تک قرآن مجید کے ساتھ مسلمانوں کا گہرا تعلق ہے۔ عہد رسالت میں صحابہ کرامؓ مشکل مسائل رسول اکرم ﷺ سے دریافت کر لیتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کی روشنی میں صحابہ کرامؓ قرآن مجید کی تشریح بیان کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ ودیگر اکابر صحابہ کے تفسیری بیانات تحریری شکل میں لوگوں کے سامنے آئے۔

ہندوستان سے عربوں کے تجارتی تعلقات بہت قدیم ہیں۔ اسلام کی آمد کے بعد بھی یہ تعلقات اسی طرح باقی رہے اور اسلام انہیں تاجروں کے ذریعہ ہندوستان میں پھیلا۔ بنوامیہ کے دور میں اسلامی مملکت ہندوستان تک وسیع ہوگئی۔ ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں سندھ باقاعدہ اسلامی سلطنت کا ایک صوبہ بن گیا۔ ان حالات میں یہاں بھی اسلامی تعلیمات کی اشاعت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس ملک

کے مخصوص حالات یہاں کے باشندوں کے مزاج اور ذہنی استعداد کے پیش نظر فقہ و حدیث اور تاریخ کے ساتھ قرآن مجید کی تفسیریں لکھی گئیں۔ ہندوستان میں فن تفسیر کی شروعات کی واضح تاریخ موجود نہیں ہے۔ڈاکٹر زبیر احمد صاحب کی انگریزی کتاب "Contribution of India to Arabic Literature" کا ایک باب ہندوستان میں علوم قرآن سے متعلق بھی ہے، جس میں انہوں نے کل ۴۷ رکتابوں کے نام لکھے ہیں لیکن ڈاکٹر سالم قدوائی صاحب نے اپنی کتاب ''ہندوستانی مفسرین اوران کی عربی تفسیریں'' میں ۱۵۶ رکتابوں کا ذکر کیا ہے جنہیں چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصہ میں ان تفسیروں کا ذکر ہے جو مکمل ہوگئیں۔ دوسرے حصے میں اجزائے قرآن کی تفسیریں ہیں۔تیسرے حصے میں قدما کی تفسیروں کے حواشی اور شرحوں کا ذکر ہے اور چوتھے حصے میں متعلقات قرآن مجید کا ذکر ہے۔

پہلا حصہ جو مکمل تفسیروں پر مشتمل ہے ان میں بعض اہم کتابوں میں '' کاشف الحقائق وقاموس الدقائق (محمد بن احمد گجراتی ۸۲۰ھ)، درر ملتقط (سید محمد گیسو دراز ۸۲۵ھ)، تفسیر تبصیر الرحمٰن وتبسیر المنان (علامہ علی مہائمی ۸۳۵ھ) منبع عیون المعانی (شیخ مبارک ۱۰۰۱ھ)، سواطع الالہام (فیضی ۱۰۰۴ھ)، تفسیر انوار الاسرار (شیخ عیسی بن قاسم سندھی ۱۰۳۱ھ) تفسیر مظہری (قاضی ثناء اللہ مظہری ۱۲۲۵ھ)، فتح البیان فی مقاصد القرآن (نواب صدیق حسن خان ۱۳۰۷ھ)

دوسرے حصے میں جو اجزائے قرآن کی تفسیروں پر مشتمل ہے ان میں تفسیر سورہ فاتحہ (عبد اللہ بن عبد الحکیم ۱۰۹۳ھ)، انوار الفرقان (غلام نقشبندی لکھنوی ۱۱۲۶ھ)، ینابیع الانوار (سید محمد تقی ۱۲۸۹ھ)، نظام القرآن وتاویل الفرقان (مولانا حمید الدین فراہی ۱۳۴۹ھ)

تیسرا حصہ قدماء کی تفسیروں کی شرحوں اور حواشی سے متعلق ہے ان میں حاشیہ تفسیر مدارک (الٰہ داد جون پوری ۹۳۳ھ)، اس کے علاوہ عبدالحکیم سیالکوٹی ۱۰۶۷ھ، علامہ وجیہ الدین علوی گجراتی ۹۹۸ھ، عبدالسلام لاہوری ۱۰۳۷ھ اور مولانا جار اللہ الٰہ آبادی ۱۱۱۰ھ نے تفسیر بیضاوی پر حاشیے لکھے اور تراب علی لکھنوی ۱۲۸۱ھ اور فیض الحسن سہارنپوری ۱۳۰۴ھ کے حاشیے جلالین پر بہت زیادہ مفید سمجھے جاتے ہیں۔

چوتھے حصے میں متعلقات قرآن کا ذکر ہے یعنی علوم قرآن سے متعلق تصانیف ہیں ان میں عمادالدین عبدالنبی اکبرآبادی ۱۰۲۷ھ کی دستور المفسرین اور محمد علی کربلائی ۱۰۴۵ھ کی ہادیہ قطب شاہیہ کی تخریج آیات سے متعلق ہے۔

مصطفیٰ بن محمد سعید کی نجوم الفرقان بھی اسی فن میں ہے۔ ملا جیون ۱۰۶۹ھ کی ''تفسیرات الاحمدیہ فی بیان آیات الشرعیہ'' احکام سے متعلق تفسیر ہے۔ جنۃ النعیم فی فضائل القرآن الکریم۔ محمد ہاشم بن عبدالغفور ۱۱۷۴ھ اور آیات الاعجاز (مولانا عبدالرشید کشمیری ۱۲۹۵ھ .وغیرہ بھی قابل ذکر تصانیف ہیں۔

ہندوستان میں سب سے پہلی تفسیر خدائی نعمت (شاہ مراد اللہ انصاری سنبھلی) جو تفسیر مرادی کے نام سے مشہور ہے، ۱۲۹۸ھ میں شائع ہوئی اس کے بعد شاہ عبدالقادر نے موضح قرآن کے نام سے اردو زبان میں پہلی مکمل تفسیر لکھی اس کے بعد مولانا اشرف علی تھانویؒ (تفسیر بیان القرآن۔ ۱۳۲۳ھ) مولوی وحید الزمان (تفسیر وحیدی۔ ۱۳۳۹ھ) خواجہ حسن ثانی نظامی کی (عام فہم تفسیر۔ ۱۳۴۳ھ) مولانا ثناء اللہ امرتسری (تفسیر ثنائی۔ ۱۳۱۳ھ) مولانا سید عبد الدائم جلالی (بیان السبحان۔ ۱۳۵۶ھ) مولانا عبدالماجد دریابادی (تفسیر ماجدی۔ ۱۳۱۷ھ) مولانا سید ابوالاعلی مودودی (تفہیم القرآن۔ ۱۳۶۸ھ) مولانا امین احسن اصلاحی (تدبر قرآن۔ ۱۴۰۰ھ) مفتی محمد

شفیع دیوبندی (معارف القرآن-۱۴۰۲ھ) اور مولانا وحید الدین خان (تذکیر القرآن-۱۴۰۷ھ) وغیرہ نے مکمل تفاسیر لکھ کر ہندوستان میں علم تفسیر کو فروغ دیا۔ان کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد (ترجمان القرآن) مولانا مناظر احسن گیلانی (تذکرہ سورہ الکہف)، مولانا عبدالحی (الفرقان فی معارف القرآن)، مولانا یوسف اصلاحی (تذکیر القرآن) مولانا حمید الدین فراہی (تفسیر سورۂ اخلاص) نے جزوی تفاسیر لکھ کر علم تفسیر میں خدمات انجام دیں۔ ان کے علاوہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی (کنز الایمان) شیخ الہند مولانا محمود الحسن و مولانا شبیر احمد عثمانی (موضح الفرقان) مولانا احمد سعید دہلوی (کشف الرحمان) وغیرہ کے تفسیری حواشی قابل ذکر ہیں۔

قرآن کریم کے ترجمے کا آغاز تیرہویں ہندوستان میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے خانوادہ نے کیا اور علم تفسیر کو فروغ دیا جو عصر حاضر تک جاری ہے۔اس کے بعد سے فارسی اردو، ہندی اور ہندوستان کی تقریباً تمام مقامی زبانوں میں قرآن کریم کا ترجمہ موجود ہے۔

☆☆☆

اردو کی چند اہم تفاسیر

ترجمان القرآن-مولانا ابوالکلام آزاد

تعارف مؤلف: مولانا آزاد کا اصل نام محی الدین احمد اور تاریخی نام فیروز بخت تھا۔مولانا ۱۸۸۸ء میں مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے۔ مولانا کے والد کا نام خیرالدین تھا جو دہلی کے رہنے والے تھے۔ والدہ محترمہ حجازی تھیں کیونکہ مولانا آزاد کے والد صاحب کی شادی حجاز کے شیخ محمد بن طاہر کی صاحب زادی سے ہوئی تھی۔ دس سال کی عمر میں مولانا کے والد کلکتہ منتقل ہو گئے۔

ابتدائی تعلیم یعنی اردو، فارسی اور فقہ وغیرہ کی تعلیم مولانا نے اپنے والد محترم سے حاصل کی اور عربی ادب، منطق اور دوسرے علوم مولوی یعقوب، مولوی نظیر الحسن، مولوی محمد ابراہیم، مولوی محمد عمر اور سید شاہ رامپوری وغیرہ سے حاصل کی۔ مولانا نے اردو صحافت کی شروعات ''الہلال'' سے کی، وہ بیک وقت دینی، سیاسی، صحافتی اور ادبی شخصیت کے مالک تھے۔ آپ کانگریس کے چوٹی کے کارکنوں میں سے تھے اور ملک کی آزادی کے لیے کئی بار جیل بھی گئے۔

آپ نے بہت ساری کتابیں تصنیف کیں، مثلاً ترجمان القرآن، اسلامی توحید، مذاہب عالم، چہار مقالہ، احسن المسالک وغیرہ۔

مولانا کی وفات ۲۲ر فروری ۱۹۵۸ء میں ہوئی۔ اور دہلی میں جامع مسجد کے قریب تدفین ہوئی۔

تعارف تفسیر: مولانا نے قرآن کریم کی تفسیر ترجمان القرآن کے نام سے شائع کی اس کی پہلی جلد میں صرف سورہ فاتحہ کی تفسیر ہے۔ اس کے علاوہ بقیہ تفسیر چار جلدوں میں سورہ نور تک ہے مولانا پورے قرآن کا ترجمہ وتفسیر اور مقدمۂ تفسیر لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن وقت نے ساتھ نہ دیا۔ جدید ایڈیشن ساہتیہ اکیڈمی نے شائع کیا ہے جو چار جلدوں میں ہے اس کے شروع میں فہرست مضامین اور اس کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین کا پیش لفظ ہے۔

مولانا نے اپنی تفسیر میں تمام تر صلاحیتوں کا استعمال کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترجمان القرآن عوام میں بے حد مقبول و مشہور ہوا۔ مولانا نے قرآن مجید کا بہت گہرا مطالعہ کیا چنانچہ خود فرماتے ہیں ''قرآن میرے شب و روز کی فکر کا موضوع رہا ہے اس کی ایک ایک سورہ، آیت، لفظ اور مقام پر میں نے مرحلہ پر مرحلہ طے کیا ہے آج تک قرآن مجید پر جو کچھ لکھا گیا ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کا بڑا حصہ میری نظر سے گذرا ہے اور علوم قرآن کے تمام ہی مباحث ومقالات کو میں نے پڑھا ہے۔

مولانا نے اسلام کو اچھی طرح سمجھا تھا اور اپنے علم و مطالعہ کی روشنی میں انھوں نے قرآن کی تفسیر کی ہے۔ آپ کا انداز معلمانہ ہے، آپ نے قرآن کو قرآن کی روشنی میں سمجھانے اور واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا کا ترجمان القرآن زبان کے اعتبار سے بہت معیاری اور ادبی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ نثر میں شاعری کرتے تھے اور قرآن کا ترجمہ بھی اسی انداز سے کیا ہے۔ سورہ فاتحہ کی تفسیر اور بیان میں تو بعض حصہ اردو ادب کے نثر کا بہترین نمونہ ہے۔ مولانا ترجمان القرآن کی مقبولیت کے متعلق فرماتے ہیں کہ میری اردو مطبوعات میں ترجمان القرآن پہلی کتاب ہے جس کو لوگوں

نے اس قدر ذوق وشوق کے ساتھ خریدا اور پڑھا کہ لوگوں کا یہ حال تھا کہ اپنی شیروانی بیچ کر ترجمان القرآن خریدنا چاہتے تھے۔

خصوصیات

(۱) مولانا نے تفسیر میں اردو زبان کے آزاد ترجمہ کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ زبان و بیان آسان ہے تاکہ اردو داں طبقہ آسانی سے سمجھ سکے۔

(۲) تفسیر میں طویل بحث کو بہت ہی مختصر طور پر لکھا ہے اور بعض جگہ تو ایک یا دو سطروں میں ہی ایک صفحہ کی تفسیر بیان کردی ہے۔

(۳) مولانا نے معجزات کی تشریح اس انداز سے کی ہے کہ وہ معجزات کے قائل تو نظر آتے ہیں۔ لیکن سرسید سے متاثر ضرور ہیں۔

(۴) شروع کی جلد میں سورہ فاتحہ کی تفسیر ہے جس میں بہت زیادہ تلاش وجستجو سے کام لیا گیا ہے اس کی نمایاں حیثیت اور مرکزیت کو دلائل سے ثابت کر کے کلام اللہ کے تمام مضامین کا مجموعہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ قرآن کی پہلی سورہ ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے اس کو ام القرآن، اساس القرآن، الکافیہ کہا ہے۔ مولانا نے اس کے مباحث کو دوسو صفحات میں جمع کردیا ہے۔

(۵) اصحاب کہف اور عیسیٰ علیہ السلام کے عفو و درگزر کی تعلیمات سے اسلامی تعلیمات کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

(۶) مولانا نے اسرائیلی روایات اور افسانوں کو دلائل کے ذریعہ رد کرنے کی کوشش کی ہے۔

(۷) مولانا کی تفسیر کو بے حد مقبولیت حاصل ہے خصوصاً تعلیم یافتہ طبقہ میں اس کی بہت اہمیت ہے اس کے دو وجوہات ہیں۔

(الف) مولانا کے زبان و بیان میں وہ دل کشی ہے جس نے ان کے ترجمے و تفسیر میں اردو ادب کے ایک شاہ کار کی شان پیدا کردی ہے۔ سورہ فاتحہ کی تفسیر و ترجمہ اس کی بہترین مثال ہے۔

(ب) کلام الٰہی کے مطالب کو اس حکیمانہ انداز میں سمجھاتے ہیں کہ جس سے نئے زمانے کی تنقیدی ذہن کی بھی بھرپور تسکین ہو جاتی ہے۔

(۸) مسلم سماج کی اصلاح بھی مولانا کے پیش نظر رہی ہے اس لیے ترجمان القرآن میں آپ روزمرہ کے واقعات کو قرآنی آئینہ میں دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

☆☆☆

معارف القرآن

مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ

تعارف مؤلف: حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کی ولادت ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۸۹۷ء میں سہارنپور کے قصبہ دیوبند میں ہوئی۔ حضرت گنگوہی جو آپ کے والد صاحب کے شیخ تھے انھوں نے ''محمد شفیع'' نام تجویز فرمایا۔

پانچ سال کی عمر میں ناظرہ کی تعلیم جناب حافظ محمد عظیم صاحب کے پاس دارالعلوم دیوبند میں شروع کی۔ والد صاحب کی خواہش تھی کہ آپ کو قرآن شریف حفظ کرائیں کچھ پارے حفظ بھی کر لیے تھے مگر جسمانی طور پر کمزور ہونے کی وجہ سے اس کی تکمیل نہ کر سکے۔ قرآن کریم کی تعلیم سے فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند ہی میں خط و املاء کی مشق اور فارسی کی تمام رائج کتابوں کی تعلیم اپنے والد محترم سے حاصل کی۔ حساب اور فنون کی تعلیم اپنے چچا جناب منشی منظور احمد صاحب سے حاصل کی۔ اس کے علاوہ عربی نحو و صرف اور فقہ کی ابتدائی کتابیں بھی اپنے والد صاحب ہی سے پڑھ لی تھیں۔

سولہ سال کی عمر میں دارالعلوم کے عربی درجہ میں با قاعدہ داخلہ لیا اور حدیث شریف اصول فقہ اور ادب عربی وغیرہ کی مشہور کتابوں کا درس لیا۔ آپ نے اپنے وقت کے مشہور اور یکتائے روزگار اساتذہ کرام سے تعلیم حاصل کی اپنے اساتذہ کے متعلق

فرماتے ہیں کہ "اگر ہم اپنے بزرگوں کی علمی گہرائی اور باطنی کمالات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ نہ کرتے تو ہمیں اپنے قدیم اسلاف، تابعین اور تبع تابعین کے حیرت ناک دینی کمالات کا مشاہداتی علم نہ ہوسکتا۔

آپ کے مشہور اساتذہ میں مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری، مولانا مفتی عزیز الرحمان عثمانی، مولانا محمد احمد ابن مولانا محمد قاسم، علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا سید میاں اصغر حسین اور مولانا اعزاز علی صاحب ہیں۔

آپ کی مشہور تصانیف میں مفید نامہ جدید، جدید صفوۃ المصادر، مفید اصاغر واکابر، شرح صفوۃ المصادر، انشاء اور رسالہ نادر وغیرہ ہیں۔

اس کے علاوہ آپ کو صحاح ستہ اور دوسری احادیث کی کتابوں کی روایت اور تدریس کی اجازت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بھی حاصل تھی۔

دس شوال المکرم ۱۳۹۶ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔

تعارف تفسیر: مولانا شفیع صاحب نے ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۳ء میں یہ تفسیر مکمل کی اس میں آیت قرآن کی توضیح وتشریح، اسلامی عقائد کی وضاحت اور فقہی مسائل، آیات قرآنی کی روشنی میں واضح انداز میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ شروع میں فہرست مضامین، پیش لفظ اور ۳۸ صفحات کا مقدمہ درج کیا گیا ہے۔ پیش لفظ اور مقدمہ ان کے صاحب زادے مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے لکھا ہے۔ مقدمہ میں علوم قرآن اور مختصر طور پر تفسیر پر روشنی ڈالی ہے یہ تفسیر آٹھ جلدوں میں چھپی ہے۔

تفسیر کے فاتحۃ الکتاب کو مولانا انظر شاہ کشمیری نے تحریر کیا ہے۔ جس میں انھوں نے مولانا مفتی صاحب سے اپنے خصوصی تعلق کو بیان کیا ہے۔ دوسرا عنوان "تفسیر عہد بعہد" ہے جس میں تفسیر کی تاریخ، ہندوستان میں تفسیر اور علوم القرآن پر مختصر

روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۹۵۴ء میں ریڈیو پاکستان کے روزانہ نشر ہونے والے درس قرآن کے متعلق آپ سے فرمائش کی گئی جس کی وجہ سے ہفتہ میں ایک دن بروز جمعہ تفسیر کے درس کو آپ نے بلا اجرت قبول کرلیا جس میں عام مسلمانوں کی موجودہ ضروریات کے پیش نظر خاص خاص آیات کا انتخاب کر کے ان کی تفسیر اور اس سے متعلق احکام و مسائل کا بیان کرنا تھا اس طرح یہ درس معارف القرآن ۱۹۶۴ء تک ریڈیو پر نشر ہوتا رہا اور لوگوں کے اصرار پر مفتی صاحب نے اس کو کتابی شکل میں جمع کر دیا۔

خصوصیات

(۱) تفسیر میں پہلے متن قرآن، بین السطور ترجمہ، اس کے بعد ربطِ آیات و خلاصہ مضامین، پھر تفسیر و تشریح اور آخر میں احکام و معارف بیان کیے ہیں۔ سورہ فاتحہ اور سورہ بقرہ کے شروع میں ترجمہ و تفسیر سے پہلے شان نزول و فضائل بھی بیان کیے ہیں۔

(۲) تفسیر میں اختلافات قرأت، صرف و نحو اور لغت و بلاغت کی بحثیں نہیں کی گئی ہیں، علمی اصطلاحات اور مشکل الفاظ سے پرہیز کیا گیا ہے تاکہ عوام کے لیے آسان بنایا جا سکے۔

(۳) تفسیر میں سلف صالحین پر اعتماد کیا گیا ہے یعنی صحابہ و تابعین سے منقول اور مستند کتب حدیث و تفسیر کو تفسیر میں جگہ دی گئی ہے۔ اور ہر موقع پر مأخذ کا حوالہ دیا گیا ہے۔

(۴) قرآن کے ترجمہ میں مولانا اشرف علی تھانوی اور شیخ الہند کے ترجمہ پر اعتماد کیا گیا ہے۔ البتہ کبھی کبھی دوسرے ترجموں سے بھی مدد لی گئی ہے۔

(۵) ترجمہ کے بعد مکمل تفسیر و تشریح سے پہلے آیات کا خلاصہ لکھا گیا ہے جو خود ایک

مختصر تفسیر کا کام دیتا ہے اور قرآن کے سمجھنے میں مددگار ہوتا ہے۔

(۶) صرف ان احکام و مسائل کو لیا گیا ہے جو الفاظ قرآن سے ثابت ہیں اور ان احکامات کا بڑا حصہ تفسیر احکام القرآن، بیان القرآن اور تفسیر روح البیان وغیرہ سے لیا گیا ہے۔ اور اپنی رائے کا استعمال بہت کم کیا گیا ہے۔

(۷) اس تفسیر میں عصر حاضر کے اہم مسائل کو اہمیت دی گئی ہے تا کہ وقت کی ضرورت پوری ہو سکے۔

(۸) ایسے مضامین کو اہمیت دی گئی ہے جو انسان کے دل میں اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ کی عظمت و محبت کو بڑھائیں اور قرآن پر عمل اور اعمال کی اصلاح کی طرف توجہ دلائیں۔

(۹) مولانا نے اپنی تفسیر میں اشرف علی تھانویؒ کی تفسیر سے استفادہ کیا ہے لیکن تصوف کے مسائل بیان کرنے میں ان سے الگ راہ اختیار کی ہے۔

(۱۰) تفسیر میں اسرائیلی روایات کا استعمال بھی کیا ہے لیکن ان کے بیان کرنے کے بعد ان پر مختصر طور سے نقد و تبصرہ بھی کرتے ہیں۔

تفسیر معارف القرآن فقہی تفسیر ہے جس میں عوام کی سہولت کے لیے روز مرہ کے مسائل پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ اس میں اسلام کا شرعی اور معاشی و سماجی نظام کا بیان آپ کے علم و فن کی دلیل ہے۔

☆☆☆

تفہیم القرآن

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

تعارف مؤلف: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ۳ر رجب ۱۳۲۱ھ مطابق ۲۵ر ستمبر ۱۹۰۳ء بروز جمعہ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد صاحب کا نام سید احمد حسن تھا جو رشتہ میں سرسید احمد خاں کے بھانجے تھے۔ مولانا مودودی کی ابتدائی تعلیم اردو، عربی، فارسی اور دینیات وغیرہ گھر پر والد صاحب کی نگرانی میں ہوئی اور انگریزی کی تعلیم ایک انگریز استاذ سے حاصل کی۔ ۱۱ر سال کی عمر میں فوقانیہ نامی اسکول میں آٹھویں جماعت میں داخل ہوئے۔ ۱۹۱۶ء میں ۱۳ر سال کی عمر میں مولانا نے میٹرک پاس کرلیا۔ دہلی کے مشہور عالم مولانا عبدالسلام نیازی سے عربی، صرف ونحو، معقولات و بلاغت کا درس لیا۔ ۱۹۳۶ء میں ۲۲ر سال کی عمر میں مولانا شریف اللہ خاں سے مدرسہ عالیہ فتح پوری سے علوم عقلیہ ونقلیہ کی سند فراغت حاصل کی۔ ۱۹۳۷ء میں مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی سے حدیث، فقہ، ادب، جامع ترمذی اور مؤطا امام مالک وغیرہ پڑھی۔ یوں تو مولانا نے سترہ سال کی عمر سے ہی صحافتی زندگی کا آغاز کردیا تھا اور روزنامہ ''تاج''، جبل پور ''مسلم'' اور ''الجمعیۃ'' دہلی کے ایڈیٹر رہے۔ ۱۹۳۱ء میں حیدرآباد سے ''ترجمان القرآن'' جاری کیا۔ یہ رسالہ دراصل عالمگیر تحریک قرآن کے

علمبردار مولوی محمد ابو مصلح سے خرید کر اپنے خیالات کے لیے وقف کیا تھا۔ ۲۵/ اگست ۱۹۴۱ء کو جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی اور پہلے امیر جماعت مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۲ء میں چودھری نیاز علی کے اصرار پر پٹھان کوٹ تشریف لے گئے لیکن تقسیم ہند کے ہنگاموں کی وجہ سے لاہور ہجرت کر گئے۔

مولانا مودودی نے یوں تو بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ لیکن ان کی سب سے معرکۃ الآراء تصنیف یہی تفہیم القرآن ہے۔ اس کے علاوہ الجہاد فی الاسلام، پردہ خطبات، رسالۂ دینیات ان کی مشہور کتابیں ہیں۔

آپ کا انتقال ۹ ۱۹۷ء امریکا میں ہوا۔ آپ کے انتقال کی خبر عالم اسلام پر بجلی بن کر گری اور ساری عالمی برادری کو سوگوار کر دیا اور کروڑوں لوگوں نے نماز جنازہ ادا کی۔

تعارف تفسیر: مولانا نے ۱۹۴۲ء میں عوام کی ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوئے قرآن مجید کا ترجمہ و تفسیر لکھنا شروع کیا۔ پانچ سال میں صرف سورہ یوسف تک ہی مکمل کر پائے تھے کہ ۱۹۴۸ء میں پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار ہوئے۔ لہٰذا دوبارہ ۱۹۷۲ء میں اس کو مکمل کیا۔ یہ تفسیر چھ جلدوں پر مشتمل ہے۔

مولانا مودودی صاحب کا بیسویں صدی کے مفسرین میں ایک منفرد مقام ہے۔ آپ نے قرآن مجید کی تفسیر دعوتی نقطۂ نظر سے لکھی ہے اور اس بات کی کامیاب کوشش کی ہے کہ قرآن کے مطالب وہ لوگ آسانی سے سمجھ سکیں جو عربی زبان سے واقفیت نہیں رکھتے اور جدید ذہن سے ہم آہنگ ہیں، جن کے دلوں میں جدید خیالات، تصورات اور نظریات نے اسلام کے اصول و کلیات سے متعلق شکوک و شبہات پیدا کر دیئے ہیں۔ مولانا نے اپنی تفسیر میں مواد کے اعتبار سے ایسا اسلوب اختیار کیا ہے کہ جن سے لوگ متأثر ہو سکیں۔ محض برکت و سعادت کی خاطر ایک نیا ترجمہ یا تفسیر نہیں لکھی ہے تاکہ تعلیم یافتہ طبقہ قرآن کی روح اور اس کے حقیقی مقصد سے روشناس

ہو سکے۔ اس وجہ سے تفہیم القرآن کو جدید ترین تفسیر میں شمار کیا جاتا ہے۔

تفسیر کی خصوصیات

(۱) مولانا نے کلام اللہ کی تفسیر زمانہ جدید اور نئے ذہنوں کو سامنے رکھ کر لکھی ہے آپ نے اسلام اور قرآن کے متعلق شکوک وشبہات کا جواب قرآن وسنت کی روشنی میں دینے کی کوشش کی ہے۔

(۲) آپ نے ترجمۂ قرآن کو اردو میں نہایت عام فہم اور سلیس زبان میں لکھا ہے تا کہ اوسط درجہ کے مسلمان بھی آسانی سے سمجھ سکیں اور قرآن کریم کے ترجمہ میں عام ترجموں سے ہٹ کر آزاد ترجمانی کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ اس لیے اس میں روانی عبارت اور زور بیان صاف ظاہر ہوتا ہے۔ ترجمہ کی زبان تقریری ہونے کی وجہ سے اس میں تاثیر کلام بہت ہے لیکن آزاد ترجمہ کرتے وقت کافی احتیاط برتی گئی ہے کہ قرآن کی عبارت جتنی آزادیٔ بیان کی گنجائش دیتی ہے اس سے تجاوز نہ ہونے پائے۔

(۳) مشکل مسائل کو آسان زبان میں سمجھانے کی کوشش کی ہے اور اگر ایک ہی لفظ بار بار استعمال ہوا ہے تو ہر جگہ اس کی وضاحت کر دی ہے تا کہ پڑھنے والا اس کا مفہوم آسانی سے سمجھ سکے۔

(۴) ہر سورت کے شروع میں شان نزول، سورہ کا تعارف، متن قرآن اور ذیل میں ترجمہ اور اس کے نیچے تفسیر بیان کی گئی ہے۔ اور کتاب کے آخر میں موضوعات کی فہرست دی گئی ہے۔

(۵) بعض آیات کو قیام حکومتِ الٰہی کے مصداق ٹھہرایا گیا ہے۔

(۶) لگتا ہے مولانا مودودی نے ترجمہ میں مولانا آزاد کے ترجمان القرآن سے استفادہ کیا ہے۔ بلکہ طریقہ وتشریح بھی وہی ہے۔ صرف معمولی تبدیلی ہے لیکن اس

کا اقرار نہیں کیا ہے۔

(۷) لفظی تراجم کا ذکر کر کے شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین، مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا فتح محمد جالندھری کی تعریف کی ہے۔

(۸) تفسیر کے شروع میں صحیح قرأت کی مخصوص علامتوں کی فہرست دی گئی ہے۔ اور آخر میں اشاریہ بھی ملتا ہے جو پڑھنے میں بہت مددگار ثابت ہوتا ہے۔

(۹) مولانا نے تفہیم القرآن کے شروع میں ایک جامع اور نصیحت آموز مقدمہ لکھا ہے اور کہتے ہیں کہ کسی کو مقدمہ کا لفظ دیکھ کر یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں قرآن کا مقدمہ لکھ رہا ہوں بلکہ یہ تفہیم القرآن کا مقدمہ ہے۔

(۱۰) مولانا کہتے ہیں کہ تفسیر کے لکھنے کے دو مقاصد ہیں۔

(الف) قرآن کے مطالعہ کرنے والے کے ذہن میں وہ باتیں آجائیں جو قرآن سمجھنے کے لیے ضروری ہیں۔

(ب) ان سوالات کا جواب دیدیا جائے جو قرآن کے متعلق لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔

مولانا کی خواہش تھی کہ لوگوں کو قرآن کے اس نقطۂ نظر سے واقف کرایا جائے کہ قرآن کے نزدیک اللہ رب العزت ساری کائنات کا خالق، حاکم، مالک اور وہی تنہا اطاعت کا مستحق ہے اور دنیا دار الامتحان ہے اور راحت و مسرت کا مقام جنت ہے۔ اصل ناکامی اس گڈھے میں پھیکے جانے میں ہے جس کا نام دوزخ ہے۔

☆☆☆

اہم سوالات

۱۔ وحی سے کیا مراد ہے؟

۲۔ وحی کی کتنی اقسام ہیں؟

۳۔ وحی کتنے طریقوں سے نازل ہوئی؟

۴۔ نزول وحی کے اسباب بیان کیجئے؟

۵۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں جمع قرآن کو بیان کیجئے؟

۶۔ عہد عثمانی میں اشاعت قرآن پر روشنی ڈالیے؟

۷۔ علم تفسیر کے ارتقاء پر روشنی ڈالیے؟

۸۔ تفسیر سے آپ کیا سمجھتے ہیں بیان کیجئے؟

۹۔ تفسیر طبری کی خصوصیات بیان کیجئے؟

۱۰۔ امام رازی کی تفسیر کے اہم نکات پر روشنی ڈالیے؟

۱۱۔ امام زمخشری کی تفسیر کی اہمیت کو واضح کیجئے؟

۱۲۔ ہندوستان میں علم تفسیر کے آغاز پر روشنی ڈالیے؟

۱۳۔ ترجمان القرآن کی خصوصیات بیان کیجئے؟

۱۴۔ معارف القرآن کی تفسیری خصوصیات بیان کیجئے؟

۱۵۔ تفسیر تفہیم القرآن کے اہم پہلوؤں کو بیان کیجئے؟

کتب برائے مطالعہ

۱۔	قرآنی معارف	مولانا نظر علی خاں
۲۔	تاریخ القرآن	مولانا اسلم جیراجپوری
۳۔	وحی الٰہی	مولانا سعید احمد اکبر آبادی
۴۔	تاریخ تفسیر و مفسرین	غلام احمد حریری
۵۔	ہندوستانی مفسرین اور ان کی تفسیریں	محمد سالم قدوائی
۶۔	اردو تفاسیر بیسویں صدی میں	ڈاکٹر سید شاہد علی
۷۔	تاریخ التفسیر	عبد الصمد صارم
۸۔	تاریخ افکار و علوم اسلامی	راغب الطباخ مترجم افتخار احمد بلخی
۹۔	معارف القرآن	مفتی محمد شفیع
۱۰۔	ترجمان القرآن	مولانا ابو الکلام آزاد
۱۱۔	تفہیم القرآن	مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ

باب دوم

علم حدیث

معنی: حدیث کے لغوی معنی بات کرنے کے ہیں۔ لیکن اصطلاح میں حدیث رسول اللہ ﷺ کے قول، فعل اور تقریر کو کہتے ہیں۔

حدیث کی قسمیں

۱۔ حدیث قولی: رسول اللہ ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے جو کچھ فرمایا اس کو حدیث قولی کہتے ہیں۔

۲۔ حدیث فعلی: رسول اللہ ﷺ نے جو کام کیا ہے اس کو حدیث فعلی کہتے ہیں۔

۳۔ حدیث تقریری: جو کام آپ ﷺ کے سامنے کسی صحابی نے کیا ہو اور آپ ﷺ نے اس سے روکا نہ ہو بلکہ برقرار رکھا ہو اسے حدیث تقریری کہتے ہیں۔ تقریر کا لغوی مطلب برقرار رکھنا ہے۔

حدیث کی اہمیت

شریعت کے احکام واصول معلوم کرنے کے ہمارے پاس دو اہم بنیادی ذرائع ہیں۔ (ا) کتاب اللہ (قرآن مجید) اور سنت رسول اللہ ﷺ۔ (حدیث)

حضور اکرم ﷺ کی زندگی یعنی آپ ﷺ کے اقوال و افعال جن کو سنت رسول ﷺ یا حدیث کہا جاتا ہے دراصل کتاب اللہ پر عمل کرنے کا طریقہ اور قرآن مجید کی مکمل تشریح تھی۔ آپ ﷺ نے عملی طور پر لوگوں کو بتایا کہ اللہ کی مرضی کے مطابق زندگی گذارنے کا طریقہ کیا ہے۔ صحابہ کرامؓ آپ ﷺ کے اقوال و افعال کو بغور دیکھتے، سنتے اور اسے اپنی جانوں و مالوں سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

کیونکہ قرآن میں ہے کہ "وہ نبی اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا بلکہ وحی ہوتی ہے جو اس کی طرف بھیجی جاتی ہے۔ (سورہ النجم ۳۔۴)

دوسری جگہ ارشاد ہے کہ "ہم نے اتارا تیرے اوپر یہ ذکر تا کہ بیان کر دے تو لوگوں کے سامنے جو چیز ان کے واسطے اتری ہے اور تا کہ وہ غور کریں" (سورہ النحل۔۴۴)

یہی وجہ ہے کہ دورِ رسالت میں اور اس کے بعد بھی ہر دور میں رسول اکرم ﷺ کے قول و فعل کی اسی طرح اطاعت و فرماں برداری ضروری ہے جس طرح قرآن کریم کی اطاعت ضروری ہے۔ قرآن میں کہا گیا ہے: "اور اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔" (سورہ آل عمران ۱۴)

"آپ ﷺ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا" (سورہ آل عمران ۔۴)

حدیث شریف میں ہے "تمہارے اوپر میری سنت لازم ہے" (مقدمہ ابن ماجہ)

جس نے میری سنت سے انحراف کیا وہ مجھ سے نہیں"

(بخاری، کتاب النکاح حدیث-۴۶۷۵)

خود حضور اکرم ﷺ نے فرمایا "میں جس چیز سے تم کو منع کروں اس سے رک جاؤ اور جس چیز کا حکم دوں اس کو حسب استطاعت بجالاؤ"

(بخاری، کتاب الاعتصام والسنۃ، حدیث-۶۷۴۴)

ایک اور جگہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔''

(بخاری، کتاب الجہاد، حدیث-۲۷۳۷)

مندرجہ بالا آیات واحادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کو دین کے اندر بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کی ہر ہر بات امت کے لیے واجب اطاعت ہے۔ ان ہی واضح آیات اور احادیث کی روشنی میں علماء اسلام حدیث کو قرآن شریف کی شرح تسلیم کرتے ہیں۔ امام اوزاعیؒ کا قول ہے کہ '' کتاب اللہ سنت کی اس سے بھی کہیں زیادہ محتاج ہے جتنی کہ سنت کتاب اللہ کی محتاج ہے''

خود قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''یقیناً تمہارے لیے اللہ کے رسول ﷺ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔ اس کے لیے جو اللہ کی اور یوم آخرت کی امید رکھتا ہے اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرتا ہے (سورۃ احزاب-۲۱)

حدیث کی ضرورت

زندگی کی سیدھی راہ پانے کے لیے انسان ہمیشہ خدا کی رہنمائی کا محتاج رہا ہے۔ انسان کی ہدایت کے لیے اللہ نے کتابیں نازل کیں اور اپنے رسول بھیجے۔ رسولوں نے لوگوں کے سامنے کتاب اللہ کے مفہوم ومنشا کو واضح کیا اور خدا کے احکام کے مطابق عمل کر کے انھیں دکھایا تا کہ لوگ سمجھ سکیں کہ خدا کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا طریقہ کیا ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ انسانوں کی یہ بھی ایک ضرورت ہے کہ زندگی کے تمام معاملات میں کوئی ان کے ساتھ شریک ہو کر اپنے قول وعمل سے ان کی صحیح رہنمائی کر کے ان کی تربیت کرے اور ان کے اندر اتباع حق کا جذبہ پیدا کرے۔ انسانوں کی اس ضرورت کو پورا کرنے

ئے لیے خدا نے کتاب کے ساتھ رسول بھی بھیجا۔ شروع سے ہی ہر قوم میں رسول آئے انہوں نے اپنی قوم کی رہنمائی کی۔ خدا کے آخری رسول حضرت محمد ﷺ ہیں آپ ﷺ کے بعد انسانوں کی ہدایت کے لیے کوئی نیا رسول آنے والا نہیں ہے لہذا حضور اکرم ﷺ کے اقوال و افعال مسلمانوں کے لیے اسی طرح دستور العمل کی حیثیت رکھتے ہیں جس طرح قرآن کریم۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "میں تمہارے درمیان دو اہم چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں جب تک کہ ان دونوں کو مضبوطی سے تھامے رہو گے گمراہ نہ ہو گے، ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری سنت"۔ (موطا امام مالک، کتاب الجامع، حدیث-۱۳۹۵)

حضور اکرم ﷺ کی زندگی قرآن کریم کی مکمل تشریح تھی۔ علم القرآن اگر اسلامی علوم میں دل کی حیثیت رکھتا ہے تو علم حدیث شہہ رگ کی۔ آیات کا شانِ نزول اور ان کی تفسیر، قرآن مجید کے احکامات کی تشریح، اجمال کی تفصیل اور عموم کی تشخیص سب علم حدیث کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے۔ آپ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی زندگی کے حالات، ہم کو صرف قرآن و حدیث سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ آپ ﷺ نے عملی طور پر اللہ کے احکامات پر چل کر دکھایا اور صحابہ کرامؓ آپ ﷺ کے ہر کام کو بغور دیکھتے، سنتے اور اس پر عمل کرتے تھے۔ کیونکہ آپ ﷺ کے متعلق اللہ تعالی فرماتا ہے "کہہ دو اے محمد ﷺ کہ میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا سوائے اس کے کہ وحی نازل ہوتی ہے" (سورۃ النجم، آیت-۲)

قرآن کریم میں موجود نماز، روزہ، حج زکوۃ وغیرہ کی تفصیل حدیث نبوی ﷺ سے معلوم ہوتی ہے۔ نظام حکومت، سماج کے اصول، حلال و حرام وغیرہ کی تفصیل بھی حدیث سے ہی معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح حامل قرآن حضرت محمد ﷺ کی سیرت، حیات طیبہ اور اخلاق و عادات مبارکہ نیز آپ ﷺ کے اقوال و اعمال علم حدیث کے ذریعہ ہی ہم تک پہونچے ہیں اسی طرح خود اسلام کی تاریخ صحابہ کرامؓ کی زندگی کے احوال و حالات کا علم بھی حدیث کے ذریعہ ہی ہوا ہے۔ اسلام کی صحیح عملی رہنمائی اسی علم کی بدولت

مسلمانوں میں قائم وموجود ہے اور انشاء اللہ قیامت تک موجود رہے گی۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے ''تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو'' (سورۃ النساء، آیت-۵۹) حضور اکرم ﷺ نے اپنی عملی زندگی اللہ کی مرضی کے مطابق گذار کر امت کے لیے ایک نمونہ پیش کیا۔ جس کو صحابہ کرامؓ نے محفوظ کر کے اسلامی تعلیمات کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے میں مدد دی۔

آپ ﷺ نے اپنے اقوال وافعال کو محفوظ کرنے کا حکم دیا تھا خطبہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''جو لوگ موجود ہیں وہ ان لوگوں تک میرا پیغام پہونچادیں جو یہاں موجود نہیں ہیں'' (بخاری، کتاب العلم، حدیث-۶۵)

شروع میں اسلام اور مسلمانوں کے حالات میں بہت تیزی سے تبدیلی واقع ہورہی تھی۔ اور لوگوں کی ضرورت کے مطابق احکامات نازل ہورہے تھے۔ ان حالات میں اگر حضور اکرم ﷺ کے اقوال وافعال لکھے جاتے تو قرآن مجید کے ساتھ آپ ﷺ کے الفاظ مل جانے کا خطرہ تھا لہذا آپ ﷺ نے حدیث لکھنے سے منع فرمادیا تھا کہ ''قرآن مجید کے سوا مجھ سے اور کچھ نہ لکھو'' (مسند احمد، حدیث-۱۰۶۶۳) لیکن بعد میں حفاظ کرام کے موجود ہونے اور مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کا باقاعدہ انتظام ہوجانے کے بعد کلام اللہ اور اقوال رسول ﷺ میں فرق کیا جانا ممکن ہوگیا تو آپ ﷺ نے حدیث لکھنے کی اجازت دے دی اور فرمایا ''میں جو کچھ کہوں یا میری زبان سے جو نکلے اس کو لکھ لو۔ اس لیے کہ اس منہ سے جو بھی نکلتا ہے وہ حق ہوتا ہے''۔ (ابوداؤد، کتاب العلم، حدیث-۳۱۶۱) اس کے بعد صحابہ کرامؓ نے حدیثیں باقاعدہ لکھنا شروع کردی تھیں۔

☆☆☆

تاریخ تدوین حدیث

ا۔عہدرسالت میں تدوین حدیث

احادیث آپ ﷺ کی زندگی میں ہی لکھی جانے لگی تھیں۔ شروع میں حضور ﷺ نے اپنے اقوال کو لکھنے سے منع فرمادیا تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں قرآن کریم نازل ہورہا تھا اور ڈرتھا کہ دوسرے نبیوں کی امتوں کی طرح کلام الٰہی اور اقوال رسول ﷺ ایک دوسرے سے مل نہ جائیں۔ لیکن جب یہ خطرہ کم ہوگیا اور صحابہ کرامؓ کی ایک ایسی جماعت تیار ہوگئی جو حافظ قرآن تھی اور کلام اللہ اور احادیث میں فرق کرسکتی تھی تو آپ ﷺ نے احادیث لکھنے کی اجازت دے دی۔ ایک انصار صحابیؓ نے حضور اکرم ﷺ سے اپنے کمزور حافظہ کی شکایت کی تو فرمایا کہ "اپنے داہنے ہاتھ سے مدد لیا کرو" (بخاری، کتاب العلم، حدیث-۲۵۹۰) اس کے بعد صحابہ کرامؓ کی ایک بڑی تعداد نے احادیث لکھنا شروع کردیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کے پاس احادیث کا ایک مجموعہ تھا جس کو وہ الصحیفۃ الصادقہ کہتے تھے یہ احادیث کا پہلا مجموعہ کہا جاسکتا ہے۔ حضرت علیؓ نے بہت سے احکامات لکھ کر تلوار کی نیام میں رکھ رکھے تھے۔ حضرت رافع بن خدیجؓ نے بھی حضور ﷺ کی اجازت سے احادیث لکھ لی تھیں۔ حضرت انسؓ اور حضرت جابر بن عبداللہؓ نے بھی احادیث جمع کی تھیں، حضرت ابوبکرؓ کے

پاس بھی احادیث لکھی ہوئی تھیں لیکن آپؓ نے بعد میں انھیں ضائع کر دیا تھا۔ کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ ''اگر کوئی شخص مجھ سے منسوب کر کے کوئی جھوٹی بات کہے تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنالے'' (بخاری، کتاب العلم، حدیث-۱۰۴) اس کے علاوہ عہد رسالت میں معاہدہ صلح حدیبیہ، امراء وسلاطین کے نام خطوط، قبائل سے صلح نامہ اور معاہدے بھی تحریری شکل میں ہوئے۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ عہد رسالت ہی میں تدوین حدیث کا کام شروع ہو گیا تھا۔

۲۔ خلفاء راشدین کے عہد میں تدوین حدیث

خلفاء راشدین احادیث کی تحریر اور بیان کرنے کے معاملہ میں بہت محتاط تھے اور رسول اللہ ﷺ کی اس تنبیہ سے ڈرتے تھے جو آپ ﷺ نے فرمائی تھی کہ ''جو شخص میری طرف منسوب کر کے کوئی بھی ایسی بات کہے جو میں نے نہ کہی ہو تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم بنالے۔'' (بخاری، کتاب العلم، حدیث-۱۰۷) اس طرح ایک مرتبہ حضرت ابوبکرؓ نے ایک حدیث بیان کی لیکن اس کے بعد آپؓ یہ کہنے لگے (جس طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ او کما قال رسول اللہ ﷺ) خلفاء راشدین میں سب سے زیادہ احادیث حضرت علیؓ نے بیان کی ہیں۔ لیکن دوسرے صحابہؓ کے مقابلہ بہت کم بیان کی ہیں۔ زیادہ احادیث روایت کرنے والے صحابہ درج ذیل ہیں: حضرت انس بن مالکؓ (۱۲۸۶)، حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ (۶۰۰۰)، حضرت ابو ہریرہؓ (۵۳۷۴)، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ (۲۶۶۰)، حضرت علیؓ نے (۵۸۶) احادیث بیان کیں۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے (۸۴۸) احادیث بیان کیں۔ ان لوگوں نے حضور ﷺ کی ہزاروں احادیث یاد کر کے امت تک پہونچایا۔ ان کے علاوہ حضرت عائشہؓ نے (۲۲۱۰) احادیث بیان کیں۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اگر یہ احادیث

بیان نہ کرتیں تو شریعت مکمل نہ ہوتی۔ان کے بعد حضرت حفصہؓ نے (۸۰) احادیث بیان کیں۔تقریباً اسی فیصد احادیث ان افراد سے روایت کی گئی ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ کے پاس احادیث لکھی ہوئی تھیں لیکن رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد انھوں نے ضائع کردی تھیں۔امام زہریؒ نے فرمایا کہ مجھے عروہ بن زبیرؒ نے بتایا کہ حضرت عمرؓ نے سنن لکھوانے کا ارادہ کیا تھا اور صحابہؓ سے مشورہ بھی کیا جس کی تائید کی گئی۔لیکن ایک ماہ تک استخارہ کرتے رہے ان کا دل کسی جانب نہیں لگا پھر ایک روز صبح کو اٹھے تو خدا نے ان کا دل ایک طرف جما دیا۔تب انھوں نے صحابہؓ سے فرمایا کہ ''میں نے سنن لکھوانے کا ارادہ کیا تھا بہت غور کیا کہ تم سے پہلے کچھ لوگوں نے اللہ کی کتاب کے ساتھ دوسری کتابیں بھی لکھی تھیں اور وہ ان کتابوں کے ہو کر رہ گئے اور کتاب اللہ کو چھوڑ دیا۔خدا کی قسم میں کتاب اللہ کے ساتھ کوئی اور چیز نہیں ملاؤں گا۔'' حضرت عثمانؓ نے احادیث جمع نہیں کیں۔حضرت علیؓ نے احادیث کی روایت احتیاط سے اور بہت کم کی ہے۔

۳۔تابعین اور تبع تابعین کے عہد میں تدوین حدیث

عہد تابعین میں کتابت حدیث کا رواج عام ہونے لگا۔تابعین نے اس حدیث کو مد نظر رکھ کر کہ ''علم کو محفوظ رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کو لکھ لیا جائے۔'' اس سرمایہ کو محفوظ کر لیا۔

حضرت سعید بن جبیرؒ سے روایت ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ پہلے تو کتابت حدیث سے روکتے تھے کہ کہیں آیات قرآنی و احادیث مل نہ جائیں لیکن بعد میں اس کی اجازت دیدی۔بلکہ دوسروں کو بھی حدیث لکھ کر محفوظ کرنے کے لیے کہتے۔ تابعین نے احادیث کے علم کو محفوظ کرنے کے لیے تحریر پر بہت زور دیا۔ان میں عطا بن

ابی رباح اور قتادہ بن السدوسی مشہور ہیں۔

تدوین حدیث کا باضابطہ کام خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد حکومت میں شروع ہوا۔ انھوں نے تدوین حدیث کے لیے باقاعدہ احکامات جاری کیے اور عامل مدینہ ابوبکر محمد بن عمر بن حزم کو تحریر کیا کہ ''آپ کو نبی کریم ﷺ کی جو حدیث وسنت یا جو روایت عمرہ بنت عبدالرحمٰن اور قاسم بن محمد سے ملے اسے لکھ لو کیونکہ مجھے علم اور اہل علم کے مٹ جانے کا خطرہ دامن گیر رہتا ہے'' یہ دونوں حضرات، حضرت عائشہؓ کے شاگرد تھے اور ان کی روایات کے بڑے عالم تھے ابوبکر محمد بن عمر بن حزم نے خلیفہ کے حکم کی تعمیل کی لیکن اس سے پہلے کہ مطلع کرتے عمر بن عبدالعزیز کا انتقال ہوگیا۔ انھوں نے اس طرح کے احکامات دوسرے صوبوں میں بھی بھیجے تھے مثلاً حجاز کے عالم امام محمد بن شہاب زہری نے ان کی دعوت پر لبیک کہا اور ان کے عزائم کو عملی جامہ پہنایا۔ اور حدیث کی ایک کتاب مرتب کر کے بھجوادی تھی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے اپنی وفات سے پہلے اس کی نقلیں کرا کر اطراف ملک میں بھجوائیں۔ امام زہری اس پر فخر کرتے ہوئے فرماتے تھے کہ ''اس علم کو میری طرح مجھ سے پہلے کسی نے بھی مدون نہیں کیا'' اس کے علاوہ سعید بن جبیر متوفی ۹۵ھ جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے خاص شاگرد تھے انھوں نے اپنے استاد کی احادیث لکھ لی تھیں۔ حضرت عروہ بن زبیرؒ ۹۴ھ حضرت عائشہؓ کے بھانجے اور خاص شاگرد تھے ان کو مغازی کی تاریخ پر عبور تھا۔ انہوں نے سیرت پر دو کتابیں لکھیں۔ امام شعبیؒ ۱۰۴ھ خود بھی احادیث لکھتے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے آپ کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ ابواب کے تحت پہلی احادیث کی کتاب مرتب کی۔

۴۔ دوسری صدی ہجری میں تدوین حدیث

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے انفرادی طور پر تدوین حدیث کا جو کام ہو رہا تھا

اس کو اجتماعی طور پر باقاعدہ شروع کرا دیا۔ ان کی وفات کے بعد دوسری صدی ہجری میں تابعین و تبع تابعین کی ایک بڑی تعداد نے تدوین حدیث میں دلچسپی لی۔ ان میں عبد الملک بن جریج مکی متوفی ۱۵۰ھ، سعید بن ابی عروبہ متوفی ۱۵۶ھ، معمر کلبی متوفی ۱۵۲ھ، امام ابوحنیفہ متوفی ۱۵۰ھ، ربیع بن صبیح متوفی ۱۶۵ھ امام مالک متوفی ۱۷۹ھ، ابن اسحاق متوفی ۱۵۱ھ علم حدیث کے عالم تھے۔ جنھوں نے حدیث کے مجموعے مرتب کیے اور نہایت محنت اور احتیاط کے ساتھ علم حدیث ہم تک پہونچایا۔

ابن جریج مکی، ابن اسحاق، سعید بن عروبہ، معمر یمنی، امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام احمدؒ، امام شافعیؒ وغیرہ نے دوسری ہجری کے اختتام سے پہلے احادیث کو اقوال صحابہ اور فتاوی تابعین سے الگ کر کے محفوظ کیا۔ اور بہت سی مسانید وجود میں آئیں ان میں عبداللہ ابن موسیٰ کوفی، اسد ابن موسیٰ الاموی اور نعیم بن حماد وغیرہ نے لکھیں پھر ان کے نقش قدم پر دوسرے علماء بھی چلے اور انھوں نے بھی مسانید لکھیں۔

۵۔ تیسری صدی ہجری میں تدوین حدیث

یہ بنو عباس کی خلافت کے شباب کا دور ہے جس میں احادیث کو نہ صرف اقوال صحابہ و تابعین سے الگ مدون کیا گیا بلکہ احادیث کی صحت کا بھی خیال رکھا گیا۔ اور صحیح احادیث پر مشتمل مجموعے مدون کیے گئے ان میں امام احمد بن حنبلؒ، اسحاق بن راہویہؒ اور ابوبکر بن ابی شیبہؒ وغیرہ ہیں ان کے بعد امام بخاریؒ نے بخاری شریف، امام مسلمؒ نے صحیح مسلم، امام ابوداؤدؒ نے سنن ابی داؤد، امام ترمذیؒ نے جامع ترمذی، امام ابن ماجہؒ نے سنن ابن ماجہ، امام نسائیؒ نے سنن نسائی کے مجموعے مرتب کئے یہ چھ کتابیں صحاح ستہ کہلائیں جو صحیح احادیث پر مشتمل ہیں اور آج بھی حدیث کی معتبر اور بنیادی کتابیں شمار کی جاتیں ہیں۔

☆☆☆

اصطلاحات حدیث

حدیث: حدیث کے لغوی معنی یوں تو بات کرنے کے ہیں لیکن اصطلاح میں رسول اللہ ﷺ کے قول، فعل اور تقریر کو حدیث کہتے ہیں۔

صحابی: صحابی اس خوش نصیب شخص کو کہتے ہیں جسے ایمان کی حالت میں آنحضرت ﷺ سے ملاقات کی سعادت حاصل ہوئی ہو۔ اور ایمان ہی کی حالت میں اس کا انتقال ہوا ہو۔

تابعی: وہ خوش نصیب شخص ہے جسے ایمان کی حالت میں کسی صحابی سے ملنے کا شرف حاصل ہوا ہو۔ اور ایمان ہی کی حالت میں وہ دنیا سے رخصت ہوا ہو۔

تبع تابعی: اس خوش نصیب شخص کو کہتے ہیں جس نے ایمان کی حالت میں کسی تابعی سے ملاقات کی ہو۔ اور ایمان کی ہی حالت میں وہ دنیا سے رخصت ہوا ہو۔

اثر: صحابہ کرامؓ کے قول وعمل کو اثر کہا جاتا ہے۔

سند: حدیث کے روایت کرنے والوں کے سلسلہ کو سند کہتے ہیں۔

متن: حدیث کی اصل عبارت یا الفاظ کو متن کہتے ہیں۔

راوی: جو اپنی سند کے ساتھ حدیث کی روایت کرتا ہے اسے راوی کہتے ہیں۔

مروی: روایت کی ہوئی حدیث یا قول کو مروی کہتے ہیں۔ یہ عام ہے خواہ حضور اکرم ﷺ کی جانب منسوب ہو یا صحابہ و تابعین کی طرف منسوب ہو۔

صریح: وہ حدیث ہے جس میں صاف طور پر یہ ذکر ہو کہ وہ حضور اکرم ﷺ کا قول و عمل یا تقریر ہے۔

حدیث قدسی: جس حدیث کی روایت نبی کریم ﷺ خدا کی طرف منسوب کر کے فرمائیں اسے حدیث قدسی کہتے ہیں۔

سند کے اعتبار سے حدیث کی قسمیں

مرفوع: وہ قول و عمل یا تقریر جو نبی کریم ﷺ کی جانب منسوب ہو خواہ آپ کی طرف اسے کسی صحابی نے منسوب کیا ہو یا کسی تابعی نے حدیث مرفوع کہلاتی ہے۔

موقوف: جس حدیث کی روایت کا سلسلہ صحابی پر پہونچ کر ختم ہو جاتا ہو۔ اسے حدیث موقوف کہتے ہیں۔

مقطوع: جس حدیث کی روایت کا سلسلہ تابعی پر ختم ہو جاتا ہو اسے حدیث مقطوع کہتے ہیں۔

ثلاثیات: ان احادیث کو کہتے ہیں جن میں راوی اور حضور ﷺ کے درمیان تین واسطے پائے جاتے ہوں۔

متصل یا موصول: وہ حدیث ہے جس کے سلسلہ سند میں شروع سے آخر تک کہیں کوئی راوی ساقط نہ ہو۔

منقطع: وہ حدیث جس کے سلسلۂ سند میں کہیں ایک یا ایک سے زیادہ راوی ساقط ہو گئے ہوں یا کوئی مبہم راوی (جس کے حالات معلوم نہ ہوں) درمیان میں آ گیا ہو۔

معضل: وہ حدیث ہے جس کے سلسلۂ سند میں مسلسل دو یا دو سے زیادہ راوی غائب ہوں۔

معلق: وہ حدیث جس کی سند کے شروع سے ایک یا کئی راوی چھوڑ دیے گئے ہوں یا پوری سند بیان نہ کی گئی ہو۔

مرسل: وہ حدیث جس کے سلسلۂ سند میں تابعی اور حضور ﷺ کے درمیان صحابی کا ذکر نہ ہو۔

درجہ و مرتبہ کے اعتبار سے حدیث کی قسمیں

صحیح: وہ حدیث ہے جس کی سند لگاتار ہو۔ راوی عادل اور قابل اعتماد ہوں۔ حافظہ اور ذہن اچھا ہو، اور روایت شاذ نہ ہو اور معلل بھی نہ ہو۔

حسن: وہ حدیث ہے جس میں صحیح حدیث کی تمام شرطیں پوری اترتی ہوں۔ لیکن راوی کے حافظہ یا ضبط میں کوئی کمی ہو۔

ضعیف: ایسی روایت جس میں صحیح حدیث کی تمام یا بعض شرائط پوری نہ ہوتی ہوں۔

متروک: جس حدیث کی سند میں کوئی راوی جھوٹا ہو یا اس کے کسی قول و فعل کی وجہ سے اس پر جھوٹ کا الزام عائد ہوتا ہو۔

راویوں کی تعداد کے اعتبار سے حدیث کی قسمیں

متواتر: وہ حدیث جس کے راوی ہر دور میں اتنی بڑی تعداد میں پائے جاتے ہوں کہ ان کا جھوٹ پر متفق ہونا ممکن نہ ہو۔

مشہور: وہ حدیث جس کے راوی صحابہ کرامؓ کے بعد کسی دور میں بھی تین سے کم نہ ہوں۔ بلکہ ہر طبقہ میں تین یا تین سے زیادہ ہوں۔

عزیز: وہ حدیث جس کے راوی ہر دور میں دو سے کم نہ ہوں۔

غریب: وہ حدیث جس کے سلسلۂ سند میں کسی دور میں ایک ہی راوی ہو۔

شاہد: ایک حدیث کسی صحابی نے روایت کی ہے ایسی ہی دوسری حدیث کسی دوسرے صحابی سے مل جائے جس سے پہلی حدیث کی تائید ہوتی ہو تو اس کو شاہد کہتے ہیں۔

مخالفت کے اعتبار سے حدیث کی قسمیں

مقبول: وہ حدیث جسے روایت و درایت کے لحاظ سے ائمہ حدیث نے قابل حجت قرار دیا ہو۔

مردود: ایسی حدیث جسے روایت و درایت کے لحاظ سے ائمہ حدیث نے ناقابل حجت ٹھہرایا ہو۔

شاذ: وہ حدیث جس میں ثقہ راوی اپنے سے قوی تر راوی کی مخالفت کرتا ہو۔

محفوظ: وہ حدیث جس کا راوی ثقہ ہو لیکن اس کی مخالفت اس سے کم درجہ کا ثقہ راوی کرتا ہو۔

منکر: وہ حدیث جس کا راوی ضعیف ہو اور وہ اپنے سے ثقہ یا قوی راوی کی مخالفت کرتا ہو۔

معروف: ایسی حدیث جس کا راوی قوی ہو اور اس کی مخالفت ضعیف راوی نے کی ہو۔

☆☆☆

امام بخاریؒ

(ولادت ۱۹۴ھ۔ وفات ۲۵۶ھ)

نام ونسب: ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری ۱۳؍شوال ۱۹۴ھ بخارا میں پیدا ہوئے۔ ان کا نام محمد اور کنیت ابوعبداللہ ہے۔ سلسلۂ نسب محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ بن بروزبہ ہے۔ بروزبہ مجوسی تھے ان کے بیٹے مغیرہ نے امیر بخارا یمان جعفی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اس لیے جعفی مشہور ہوئے۔

ابتدائی حالات: ان کے والد اسماعیل بہت بڑے محدث تھے۔ امام بخاری نے یتیمی کی حالت میں پرورش پائی آپ بچپن میں نابینا تھے۔ والدہ محترمہ کی دعا سے بینائی واپس آگئی۔ حدیث سے آپ کو بچپن سے ہی لگاؤ تھا ۲۰۵ھ سے حدیث کی سماعت شروع کی اور ۱۶ سال کی عمر میں عبداللہ بن المبارک اور امام وکیع کی جمع کی ہوئی حدیثوں کو یاد کرلیا اور اپنی والدہ اور بھائی کے ساتھ حج کے لیے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔ حج سے فارغ ہونے کے بعد والدہ اور بھائی واپس آگئے لیکن آپ حصول حدیث کی غرض سے حجاز میں ٹھہر گئے امام بخاری نے علم حدیث کے لیے بہت سے سفر کئے۔ بخارا میں محمد بن سلام سے، بلخ میں مکی بن ابراہیم سے، بغداد میں عفان سے، مکہ میں المقری سے اور کوفہ میں عبداللہ بن موسیٰ سے علم حدیث حاصل کیا۔ اس کے علاوہ آپ

کے شیوخ میں امام مالک، حماد بن زید، عبداللہ بن مبارک، ابو عاصم اور ابوالیمان وغیرہ ہیں۔

علم حدیث کے لیے سفر کرنا: ۱۸ر سال کی عمر میں مدینہ آکر حضور ﷺ کے روضۂ مبارک کے پاس تالیف وتصنیف کا کام شروع کیا آپ نے صحابہ وتابعین کے واقعات، ان کی عظمت اور اقوال وحالات پر ایک کتاب ''التاریخ الکبیر'' کے نام سے لکھی۔ اس کے علاوہ ''قضایا الصحابہ والتابعین'' بھی لکھی۔ امام بخاری نے علم حدیث کے لیے خراسان، عراق، شام اور مصر کا سفر کیا، شام ومصر اور جزیرہ دوبار گئے۔ حجاز میں ۶ر سال قیام کیا۔ کوفہ اور بغداد کئی بار گئے۔ حج کے موقع پر مکہ ضرور جاتے اور حدیث جاننے والوں سے ملاقاتیں کرتے اور حدیثیں جمع کرتے۔

اساتذہ وشیوخ: امام بخاری کے اساتذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ امام صاحب کہتے ہیں کہ میں نے ایک ہزار اسی آدمیوں سے احادیث لکھیں ان میں اسحاق بن راہویہ، علی بن المدینی، قتیبہ بن سعید، محمد عبداللہ انصاری، ابوعاصم النبیل، احمد بن حنبل، مکی بن ابراہیم، عبداللہ بن موسیٰ، عبداللہ بن زبیر، محمد بن یحییٰ ذہلی اور ابوحاتم رازی زیادہ مشہور ہیں۔

شاگرد: امام بخاری کا حلقۂ درس بہت وسیع تھا۔ ان کے شاگردوں میں بڑے بڑے اہل علم اور محدثین شامل ہیں۔ مثلاً ابوزرعہ، ابوحاتم، حافظ ابوعیسی الترمذی، ابوعبد الرحمٰن الصناعی، امام مسلم، امام نسائی، ابن خزیمہ اور محمد بن نصر مروزی وغیرہ مشہور ہیں۔

امام بخاری کی یادداشت غیر معمولی تھی۔ کہتے تھے کہ مجھے ایک لاکھ صحیح اور دو لاکھ غیر صحیح احادیث یاد ہیں اور جامع صحیح کو میں نے چھ لاکھ احادیث سے منتخب کیا ہے۔ آپ نہایت عابد ومتقی تھے۔ والد صاحب سے جو مال ترکہ میں ملا اس کو خرچ کردیا اور خود سالن تک استعمال نہیں کرتے تھے۔ ابن خزیمہ کہتے ہیں کہ ''اس آسمان کے نیچے امام

بخاری سے بڑھ کر میں نے عالم حدیث نہیں دیکھا ہے'' امام مسلم فرماتے ہیں کہ ''ان کے مثل دنیا میں کوئی نہیں ہے'' امام بخاری کو علم حدیث سے جو شوق تھا اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ وہ ایک رات میں پندرہ پندرہ اور بیس بیس مرتبہ اٹھ کر چراغ روشن کرتے اور حدیث کا مطالعہ کرتے اور سو جاتے۔ امام بخاری دو سو پچاس ہجری میں نیشاپور گئے لیکن وہاں محض فتنہ انگیزی کے لیے مسئلہ خلق قرآن کے بارے میں سوال و جواب پر انہیں مجبور کیا گیا۔ تو آپ نے قرآن کو اللہ کا کلام بتلایا۔ معتزلہ کے حامیوں نے ہنگامہ کیا مجبور ہو کر اپنے وطن بخارا واپس آ گئے۔

امام بخاری کے دل میں حدیث رسول ﷺ کی بڑی عظمت تھی۔ جب امیر بخارا خالد بن احمد نے ان سے درخواست کی کہ وہ اس کی مجلس میں آ کر اپنی تالیف جامع اور تاریخ سنائیں تو امام بخاری نے صاف انکار کر دیا۔ اور کہا کہ میں علم کو ذلیل نہیں کرتا۔ حدیث سننی ہو تو میری مسجد میں آ جایا کرو اگر بادشاہ ہونے کی وجہ سے میری بات بری معلوم ہو تو مجھے حکماً روک دو تا کہ میں خدا کے سامنے اپنا عذر پیش کر سکوں۔ کیونکہ میں علم کو چھپانے والا نہیں ہوں۔ اس نے کہا کہ کم از کم شہزادوں کے لیے ایک مجلس مخصوص کر دیں جس میں وہ آپ سے علم حاصل کریں۔ اس مجلس میں شہزادوں کے علاوہ کوئی شریک نہ ہو۔ امام بخاری کو یہ تقسیم بھی گوارا نہ ہوئی۔ لہذا وہ آزمائش سے دوچار ہوئے۔ یہاں تک کہ انہیں اپنا وطن تک ترک کرنا پڑا۔

بخارا سے نکل کر امام بخاری نیشاپور گئے۔ یہاں کا امیر بھی ان کا دشمن ہو گیا بالآخر سمرقند کے قریب خرتنگ مقام پر قیام فرمایا اور وہیں ۶۳ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ جب انہیں دفن کیا گیا تو ان کی قبر سے مشک کی خوشبو آ رہی تھی۔

تصنیفات

(۱) التاریخ الکبیر، التاریخ الصغیر، قضایا الصحابہ والتابعین، التاریخ الأوسط، خلق افعال العباد، قرأت خلف الإمام، مسند الکبیر، التفسیر الکبیر، کتاب الھبہ، کتاب الأشربہ، کتاب المبسوط، کتاب العلل، کتاب الفوائد، کتاب الأدب اور جامع الصحیح البخاری ہیں۔

الجامع الصحیح (بخاری شریف): امام بخاری کا سب سے بڑا کارنامہ الجامع الصحیح ہے۔ صحیح بخاری کے مرتب کرنے کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ ایک دن وہ اپنے استاذ اسحاق بن راہویہ کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے وہاں یہ بات آئی کہ کوئی ایسی کتاب تیار ہو جس میں ایسی حدیثیں جمع ہوں جو صحت کے اعتبار سے اعلیٰ درجے کی ہوں۔ تاکہ معتبر اور مستند حدیثیں ایک جگہ جمع ہو جائیں اور لوگ ان پر عمل پیرا ہوسکیں۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ اس مجلس کے بعد میرے دل میں یہ بات بیٹھ گئی اور وہ اس کام کے لیے تیار ہوگئے ایک وجہ اور بیان کی جاتی ہے کہ امام بخاری نے خواب میں دیکھا کہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ میرے ہاتھ میں پنکھا ہے جس سے میں آپ ﷺ کے اوپر سے مکھیوں کو ہانک رہا ہوں۔ جس کی تعبیر یہ بیان کی گئی کہ تم ان جھوٹی حدیثوں کو رفع کروگے جو نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ امام بخاری کا شوق اور بڑھ گیا اور جامع صحیح کی تالیف میں مصروف ہوگئے۔

صحیح بخاری ۱۶/ سال کی مدت میں مکمل ہوئی اس کتاب کے بارے میں امام بخاری بیان کرتے ہیں کہ میں نے اس کتاب کے مسودے کو حضور اکرم ﷺ کی قبر انور اور ممبر کے درمیان بیٹھ کر صاف کیا ہے۔ میں نے کوئی ایک حدیث بھی ایسی درج نہیں کی جس کی صحت کے بارے میں مجھے پورا اعتماد نہ ہو۔ وہ کہتے ہیں ''میں نے اس کتاب کو اپنے اور خدا کے درمیان حجت بنایا ہے''۔

خصوصیات

ا۔امام بخاری نے اپنی کتاب میں صرف ان ہی حدیثوں کو جمع کیا ہے جو صحت کے اعتبار سے اعلیٰ درجے کی ہیں۔جو ان کے معیار پر پوری نہ اتر سکیں ان کو انھوں نے اس کتاب میں جگہ نہ دی۔

۲۔امام بخاری نے اس کتاب میں فقہی مسائل اور حکیمانہ نکات کا بھی خیال رکھا ہے۔اور وہ احادیث کے ذخیرے سے فقہ کے علاوہ سیرت وتفسیر کا بھی استنباط کرتے ہیں۔

۳۔امام بخاری کا سارا کمال ان کے تراجم ابواب میں ہے۔

۴۔امام بخاری ہر کتاب کے شروع میں کبھی کبھی زمانۂ نزول اور اس کی ابتداء کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔خاص طور سے جب اس کے بارے میں کوئی اختلاف پایا جاتا ہو۔

۵۔امام بخاری نے دورانِ تالیف جب دوبارہ لکھنا شروع کیا تو ابتداء بسم اللہ سے کی اسی لیے بہت سی جگہوں پر بسم اللہ لکھی ہوئی ہے۔

۶۔جب حدیث میں کوئی غریب لفظ آجاتا اور اس کی نظیر کتاب اللہ میں موجود ہوتی تو وضاحت میں مفسرین کے اقوال نقل کرتے ہیں۔اور کبھی بات کی مناسبت سے قرآنی آیات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

۷۔بخاری شریف میں ۲۲ روایات ثلاثی ہیں۔

۸۔انہوں نے مکرر روایات سے پرہیز کیا ہے لیکن پھر بھی کتاب میں بائیس روایات مکرر ہیں۔

۹۔ ہر کتاب کے اختتام پر وہ کوئی نہ کوئی ایسا لفظ لاتے ہیں کہ جس سے کتاب کے خاتمہ کی طرف اشارہ ہوجاتا ہے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ وہ ہر کتاب کے خاتمہ پر ایسا کوئی لفظ لاتے ہیں جس سے زندگی کے خاتمہ کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے۔ اس سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کتاب کو پڑھتے وقت انسان کو موت اور آخرت یاد آجائے۔ امام صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے مسجد حرام میں اس کو لکھا اور ہر حدیث کو درج کرنے سے پہلے اللہ تعالی سے استخارہ کرتا اور دو رکعت نماز پڑھتا اور جب حدیث کی صحت پر پوری طرح اطمینان ہوجاتا تو اسے کتاب کے اندر جگہ دیتا۔ اس اہتمام کی وجہ سے لوگ کہتے ہیں کہ امام بخاری نے گویا براہ راست حضور اکرم ﷺ سے سنا ہے۔

۱۰۔ امام بخاری ایسے راویوں سے حدیث بیان کرتے ہیں کہ جس کے سارے راوی مشہور اور ثقہ ہوں اور محدثین کا ان پر اتفاق ہو سند متصل ہو، جس روایت کے صحابی کے بعد دو یا دو سے زیادہ راوی ہوں وہ نہایت اعلیٰ ہوگی اور اگر ایک ہی راوی ہو لیکن سند صحیح ہو تب بھی حدیث صحیح ہوگی۔

۱۱۔ امام بخاری نے اپنی کتاب کو کتاب التوحید پر ختم کیا ہے کیونکہ توحید ہی آخرت میں کامیابی و ناکامی کی اصل میزان ہے۔ اور کتاب کی شروعات ''انما الاعمال بالنیات'' کی حدیث سے کی ہے کیونکہ اعمال کی مقبولیت کے لیے اخلاص نیت ضروری ہے۔

۱۲۔ بخاری شریف میں کل ۹۰۸۲ احادیث ہیں اور تکرار کو ختم کرنے کے بعد چار ہزار حدیثیں باقی رہتی ہیں۔ جن کا انتخاب ۶ رلاکھ احادیث سے کیا گیا ہے اس میں ایک سو ساٹھ کتاب ۳۴۵۰ ابواب ہیں۔ صحیح بخاری کو براہ راست امام بخاری سے ۹۰

ہزار لوگوں نے پڑھا اور اس کا املا کیا۔ آج عالم اسلام میں اس کتاب کے راویوں کی تعداد لاکھوں تک پہونچتی ہے۔

بخاری شریف کو بجا طور پر اصح الکتب بعد کتاب اللہ کہا جاتا ہے۔

جن لوگوں کو اس کتاب کے مطالعہ کا موقع ملا ہے وہ اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ یہ کتاب محض احادیث کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ اسے اصول وعقائد سے لے کر اسلامی معاشرت، غزوات وسیرت اور معاملات وسیاست وغیرہ علوم اسلامی کی ایک مختصر انسائیکلوپیڈیا کہا جاسکتا ہے۔ صحیح بخاری کی علماء حدیث نے ۵۳ شرحیں لکھیں ہیں۔ جن میں بعض شرحیں تو چودہ چودہ جلدوں پر مشتمل ہیں۔ مثلاً فتح الباری عمدۃ القاری، ارشاد الباری، ہدایۃ الباری، تیسیر القاری وغیرہ کافی مشہور ہیں۔

☆☆☆

امام مسلمؒ

(ولادت ۲۰۶ھ - وفات ۲۶۱ھ)

نام ونسب: مسلم بن حجاج بن داؤد بن کوشاد کا نام مسلم لقب عساکر الدین اور کنیت ابو الحسین ہے آپ کا سلسلۂ نسب عرب کے قبیلہ قشیر سے ملتا ہے۔ آپ کی پیدائش خراسان کے شہر نیشاپور میں ۲۰۶ھ میں ہوئی۔ اس وقت نیشاپور میں علماء و محدثین کا ایک بڑا طبقہ موجود تھا۔ امام مسلم ایک جلیل القدر محدث تھے ان کا شمار علم حدیث کے ائمہ میں ہوتا ہے۔

اساتذہ وشیوخ: آپ نے چودہ سال کی عمر میں حصول علم حدیث کی خاطر عراق، حجاز، مصر، شام اور دوسرے اسلامی ملکوں کا سفر کیا۔ آپ سب سے پہلے اسحاق بن راہویہ اور امام ذہلی سے نیشاپور میں، عراق میں امام احمد بن حنبل اور عبداللہ بن مسلم سے، حجاز میں سعید بن منصور اور ابو مصعب سے، مصر میں عمرو بن سواد اور حرملہ بن یحیٰ سے فیضیاب ہوئے۔ اس کے علاوہ امام بخاری، عبداللہ بن مسلمہ القعنبی، سعید بن منصور اور محمد بن مہران سے علم حدیث حاصل کیا۔

شاگرد: آپ نے بغداد میں حدیث کا درس دینا شروع کیا جن لوگوں نے امام مسلم سے حدیث کی سماعت شروع کی ان میں چند کے نام یہ ہیں ابراہیم بن محمد

امام ابوعیسیٰ ترمذی، ابن خزیمہ، ابوحاتم رازی، ابوبکر بن خزیمہ، یحیٰ بن سعادہ اور ابوعوانہ وغیرہ۔

امام مسلم حق گو، صلح پسند، اخلاق وشرافت اور زہد وتقویٰ میں بے مثال تھے۔ امام بخاری کی مجلس میں ہمیشہ حاضر رہتے لیکن جب ہجوم زیادہ بڑھا تو لوگوں کو حسد ہونے لگا۔ یہاں تک کہ امام ذہلی نے بھی فتنۂ خلق قرآن میں امام بخاری کے مسلک کی مخالفت کی تو آپ نے ان کی مجلس میں ان سے روایت کا مسودہ امام ذہلی کو واپس کر کے ان سے روایت کرنا بند کر دیا۔ امام مسلم کے مسلک کا تعین کرنا مشکل ہے کیونکہ ان کے اندر مجتہدانہ صلاحیت تھی البتہ امام شافعی کی طرف مائل تھے۔

وفات: امام مسلم کی وفات ۲۵/ رجب ۲۶۱ھ میں ہوئی ان کی وفات کے متعلق آتا ہے کہ ایک مسئلہ کی تحقیق وجستجو میں ایک حدیث کی تلاش میں اس قدر مشغول ہوئے کہ کھجوروں کا بھرا ٹوکرا قریب رکھا تھا۔ کھجوریں کھاتے جاتے اور حدیث تلاش کرتے جاتے بے خیالی میں اس قدر کھجور کھائیں کہ وہ ان کی موت کا سبب بن گئیں۔ امام رازی کہتے ہیں کہ میں نے امام مسلم کو خواب میں دیکھا ان کا حال پوچھا تو انھوں نے جواب دیا کہ اللہ تعالی نے اپنی جنت کو میرے لیے مباح کر دیا ہے جہاں چاہتا ہوں رہتا ہوں۔

تصنیفات

امام مسلم کے دور کے تمام اہل علم ان کے علم وفضل کی گواہی دیتے ہیں۔ حدیث کی صحت وسقم پہچاننے میں انہیں خاص امتیاز حاصل تھا۔ امام مسلم کی تصنیفات بہت زیادہ ہیں مثلاً الجامع الصحیح، مسند کبیر، جامع کبیر، کتاب العلل، کتاب الأفراد کتاب موالات، احمد بن حنبل، کتاب اولاد الصحابہ، کتاب الطبقات، کتاب افراد الشامین کتاب الملل، کتاب اوہام المحدثین، کتاب تمیز، کتاب مشائخ ثوری وغیرہ۔

خصوصیات

الجامع الصحیح (مسلم شریف) امام مسلم کا عظیم کارنامہ جامع صحیح ہے جو صحاح ستہ میں شامل ہے۔ اس کتاب کے بارے میں حافظ ابو علی نیشاپوری کہتے ہیں کہ "علم حدیث میں آسمان کے نیچے مسلم سے بڑھ کر کوئی صحیح کتاب نہیں"

۱۔ امام مسلم کا بیان ہے کہ میں نے اپنی صحیح کو تین لاکھ حدیثوں سے انتخاب کر کے مرتب کیا ہے۔

۲۔ امام مسلم نے اپنی کتاب میں صرف ان حدیثوں کو جگہ دی جس کے راوی امام مسلم سے لے کر حضور اکرم ﷺ تک ہر دور اور ہر طبقہ میں کم از کم دو لوگ رہے ہوں۔

۳۔ امام مسلم کے نزدیک راوی کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ وہ عادل ہے بلکہ ضروری ہے کہ وہ شہادت کی تمام شرطوں پر پورا اترتا ہو۔

۴۔ صحیح مسلم کی تعداد، روایات مکررات کو ختم کرنے کے بعد چار ہزار ہے۔

۵۔ امام مسلم نے جن صحابہ کی روایات اپنی کتاب میں شامل کی ہیں ان کی تعداد دو سو اٹھارہ ہے جب کہ بخاری میں یہ تعداد دو سو آٹھ ہے۔

۶۔ امام مسلم نے اس کتاب کو ابواب میں تقسیم کیا ہے اور باب سے متعلق احادیث کو جمع کر دیا ہے شرط یہ رکھی ہے کہ تمام راوی عادل، ثقہ، متصل اور علت سے پاک ہوں۔ شیخ کے ساتھ زیادہ رہے ہوں، متقی ہوں۔

۷۔ صرف ان احادیث کا انتخاب کیا ہے جن پر اس دور کے علماء کا اجماع ہو۔

۸۔ احادیث کے متن کے اعتبار سے کتاب کی تقسیم کی ہے۔ ان کا مقصد صحیح احادیث کو منتخب کرنا تھا۔

۹۔امام مسلم نے حدیث کے متنوں کو اس طرح جمع کیا ہے کہ اس سے حدیثوں کے معنی واضح سے واضح تر ہوتے جاتے ہیں۔ جب کہ امام بخاری کے یہاں ایسا نہیں ہے۔

۱۰۔امام مسلم نے ہر ایک حدیث کے لیے ایک مناسب مقام متعین کیا ہے۔ اور پھر وہیں اس حدیث کے تمام طریقوں اور اس کے مختلف الفاظ کو جمع کر دیا ہے۔ دیکھنے والے کو تمام طریقوں سے واقف ہو کر استفادہ کا موقع مل جاتا ہے۔

۱۱۔امام مسلم نے الفاظ کی رعایت کی ہے۔ یہاں تک کہ ایک راوی نے دوسرے راوی سے ایک لفظ میں اختلاف کیا ہے گرچہ دونوں لفظوں کے معانی ایک ہی ہیں تب بھی وہ ہر ایک راوی کے لفظ کو بیان کرتے ہیں امام مسلم نے تعلیقات و بے سند روایتوں کو بہت کم بیان کیا ہے۔ جب کہ بخاری میں تعلیقات بہت ہیں۔ امام مسلم حدیث کے ساتھ صحابہ و تابعین وغیرہ کے اقوال نہیں نقل کرتے ہیں وہ نہیں چاہتے کہ حدیث دوسروں کے اقوال کے ساتھ مل جائے اس کے برخلاف امام بخاری حدیث کے ساتھ صحابہ و تابعین کے اقوال بھی لاتے ہیں۔

امام مسلم نے اگر دو یا دو سے زیادہ روایات بیان کی ہیں جن کے معنی ایک ہیں لیکن الفاظ الگ ہیں تو دونوں کی اسناد جمع کر دیتے ہیں اور راوی کے الفاظ کی نشان دہی کر دیتے ہیں۔ محدثین دو طریقوں سے درس دیتے تھے اول استاد پڑھے اور شاگرد سنے تو روایت کرتے وقت ''حدثنا'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ دوسرے شاگرد استاذ کی کتاب سے دیکھ کر پڑھے تو روایت کرتے وقت ''اخبرنا'' استعمال کرتے۔ امام بخاری نے ان دونوں لفظوں میں فرق نہیں کیا ہے جب کہ امام مسلم نے دونوں میں فرق کیا ہے امام مسلم نے ہر حدیث کو بیان کرتے وقت اس کی سند بھی بیان کی ہے چاہے وہ کئی جگہ آئی ہو۔

ان خصوصیات کی وجہ سے صحیح مسلم ایک بہترین اور مستند کتاب ہے۔ مکررات کو شامل کر کے صحیح مسلم میں بارہ ہزار احادیث ہیں اگر مکررات کو نکال دیا جائے تو چار ہزار احادیث بچتی ہیں۔ صحیح مسلم پر بہت سی شروحات وحواشی تصنیف کی گئی ہیں۔

۱۔ المفھم فی شرح غریب المسلم ۔ اسماعیل فارسی

۲۔ شرح مسلم ۔ محمد اصفہانی

۳۔ الاکمال فی شرح مسلم ۔ عیاض بن موسیٰ مالکی

۴۔ المنہاج فی شرح۔ مسلم بن حجاج ابوزکریا یحییٰ بن شرف النووی

۵۔ الدیباج علی صحیح مسلم ۔ السیوطی

۶۔ شرح مسلم ۔ ملا علی قاری

☆☆☆

امام ترمذیؒ

(ولادت ۲۰۹ھ ۔ وفات ۲۷۹ھ)

نام ونسب: محمد بن عیسیٰ بن سورہ بن موسیٰ بن ضحاک مسلمی ترمذی کا اسم گرامی محمد کنیت ابوعیسیٰ ہے۔

پیدائش ووفات: امام ترمذی ۲۰۹ھ میں ترمذ میں پیدا ہوئے اسی لیے ترمذی کے نام سے مشہور ہیں۔ ترمذ دریائے جیحون کے کنارے ایک قدیم شہر ہے۔ آپ کی وفات ۲۷۹ھ ستر سال کی عمر میں ترمذ ہی میں ہوئی۔

ابتدائی تعلیم: امام ترمذی کا شمار امام بخاری کے مشہور شاگردوں میں ہوتا ہے۔ امام مسلم اور امام ابوداؤد سے بھی آپ نے حدیث کی سماعت کی ہے۔ اس کے علاوہ قتیبہ بن سعید، علی بن حجر مروزی، ابراہیم بن عبداللہ اسماعیل بن موسیٰ اسدی، محمود بن غیلان، محمد بن بشار، احمد بن منیع، اور سفیان بن وکیع جیسے محدثین سے حدیث روایت کرتے ہیں۔ جو ان کے مشہور شیوخ ہیں۔ حدیث کی طلب میں امام ترمذی کوفہ، بصرہ، رے، خراسان اور حجاز میں سالوں سفر کرتے رہے۔

شاگرد: امام ترمذی کے شاگردوں کی تعداد کافی ہے ان میں محمد بن احمد، ابو حامد احمد بن عبد مروزی، ہیثم بن کلیب شاشی، احمد بن یوسف نسفی، داؤد بن نصر اور محمد

بن منذر ابن سعید ہروی وغیرہ مشہور ہیں۔

امام ترمذیؒ کا قوت حافظہ بہت قوی تھا جو حدیث سنتے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتی تھی۔ نہایت عابد وزاہد اور خدا ترس انسان تھے۔ خدا کا خوف اور خشیت الٰہی ان پر اتنی غالب رہتی کہ ہر وقت عبادت و ریاضت میں لگے رہتے۔ خوف خدا سے روتے رہتے تھے بالآخر ان کی آنکھوں کی روشنی جاتی رہی۔ لوگوں کی رائے ہے کہ امام بخاریؒ نے علم وحفظ اور زہد و تقوی میں امام ترمذی جیسا کوئی شاگرد نہیں چھوڑا۔ آپ نے امام بخاری سے سب سے زیادہ استفادہ کیا اور امام بخاری بھی ان کو اپنا لائق شاگرد مانتے تھے۔

جامع ترمذی: جامع ترمذی امام ترمذی کی معروف و مقبول تالیف ہے۔ محدثین کے نزدیک یہ ایک اہم کتاب ہے۔ اور اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے اسے تمام کتابوں پر فوقیت حاصل ہے۔ امام ترمذی نے اس کتاب کی تالیف میں چند باتوں کو خاص طور پر پیش نظر رکھا ہے۔

خصوصیات

۱۔ حدیثیں نقل کرتے ہیں تو صحابہؓ کے ناموں کا ذکر لازماً کرتے ہیں تا کہ حدیث کی جو حیثیت بھی ہو مشہور، متواتر یا آحاد واضح ہو جائے۔

۲۔ روایت حدیث کے ساتھ اس سے ماخوذ مسائل، فقہاء کے مذاہب، ان کے اختلافات اور پھر مذہب سے استدلال بھی نقل کرتے ہیں۔ ساتھ ہی صحابہ اور تابعین کے مذاہب کا بھی اضافہ کیا ہے۔

۳۔ ہر موقع پر یہ بات ظاہر کر دیتے ہیں کہ راوی کس درجہ کا ہے ضعیف ہے یا قوی۔ اس طرح حدیث کے بارے میں بھی بتاتے چلتے ہیں کہ وہ صحیح ہے یا حسن۔

۴۔ راویوں کے نام اور القاب وکنیت اور دیگر باتیں بھی بیان کرتے ہیں۔

۵۔ترتیب حدیث کا خیال رکھا ہے اور ساتھ ہی حدیث کی تکرار سے بھی بچتے ہیں۔

٦۔امام ترمذی نے اہل عراق اور اہل حجاز دونوں ہی کے مسائل پر الگ الگ باب قائم کر کے حدیثیں پیش کیں ہیں۔ ہر باب کے تحت جتنے صحابہؓ کی حدیثیں ملیں ان سب کی طرف صحابہ کے نام لے کر اشارے کر دئے ہیں۔

حافظ ابن اثیر کے مطابق یہ کتاب سب سے زیادہ احسن ہے اور ترتیب میں سب سے عمدہ ہے۔اس کتاب سے فقہاء، علماء اور محدثین یکساں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس میں صرف وہ احادیث بیان کی گئی ہیں جو کسی نہ کسی امام نے پہلے بیان کی ہوں نیز ان کے اختلافات اور دلائل بھی بیان کرتے ہیں اور طویل حدیث کو اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔سب سے اہم چیز یہ کہ آپ نے حضور اکرم ﷺ کے اقوال و اعمال، اخلاق، رہن سہن، لباس غرض پورا اسوہ حسنہ اور معمولات زندگی سے متعلق احادیث شمائل میں جمع کر دی ہیں۔ حدیث کے سلسلے میں امام ترمذی اور نبی کریم ﷺ تک درمیان میں کم سے کم واسطے تین ہیں اور زیادہ سے زیادہ دس ہیں جامع ترمذی میں ایک ایسی حدیث بھی ہے جس میں تین ہی واسطے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ جامع ترمذی بعض پہلوؤں سے بہترین کتاب ہے خود امام ترمذی فرماتے ہیں کہ میں نے یہ کتاب عراق، حجاز اور خراسان کے علماء کے سامنے پیش کی۔انہوں نے پسند کیا اور کہا ''جس کسی کے گھر میں یہ کتاب ہو گویا اس کے گھر میں رسول ہے جو گفتگو کرتا ہے''۔

امام ترمذی کا بیان ہے کہ انھوں نے جامع ترمذی میں دو حدیثوں کے علاوہ کوئی حدیث ایسی نہیں لی جس پر کسی نہ کسی کا عمل نہ ہو۔ اور ان دونوں پر بھی بعض اہل علم کا عمل ہے۔

جامع ترمذی کی متعدد شرحیں اور حواشی و مستخرجات ملتے ہیں۔ مثلاً

۱۔ عارضۃ الاحوذی۔ لابن العربی مالکی متوفی ۹۵۶ھ

۲۔ قوت المغتذی۔ للسیوطی۔

۳۔ تحفۃ الاحوذی۔ مولانا عبدالرحمان مبارکپوری۔

۴۔ جامع ترمذی۔ شیخ احمد محمد شاکر۔

۵۔ افادات۔ انور شاہ کشمیری۔

۶۔ معارف السنن۔ مولانا محمد یوسف بنوری۔

۷۔ الکوکب الدری۔ مولانا رشید احمد گنگوہی۔

☆☆☆

امام ابوداؤدؒ

(ولادت ۲۰۲ھ۔وفات ۲۷۵ھ)

نام ونسب: ابوداؤد سلیمان بن الاشعث سجستانی کا نام سلیمان اور کنیت ابوداؤد تھی۔والد محترم کا نام اشعث بن اسحاق تھا۔سجستان کے رہنے والے تھے۔یہ قندھار اور چشت کے قریب ایک مقام ہے۔

ولادت ووفات: آپ کی ولادت ۲۰۲ھ میں ہوئی۔امام ابوداؤد نے زندگی کا بڑا حصہ بغداد میں گذارا اور اپنی سنن کی تالیف بھی بغداد ہی میں کی۔اس لیے راوی عراقی ہیں۔امام ابوداؤد ۲۷۱ھ میں بغداد سے بصرہ آگئے اور زندگی کے آخری چار سال بصرہ میں گزارے اور یہیں ۲۷۵ھ بروز جمعہ وفات ہوئی۔

تحصیل علم کے لیے سفر: طلب علم اور حصول حدیث کے لیے عراق، خراسان، مصر، شام، حجاز، الجزائر وغیرہ اسلامی ملکوں کا سفر کیا۔علماء ومحدثین کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے روایت حدیث کی اجازت حاصل کی۔ان کے اساتذہ میں امام بخاری اور ان کے اساتذہ مثلاً امام احمد بن حنبل، قعنبی ابوالولید طیالسی، مسلم بن ابراہیم،

یحیٰ بن معین، عثمان بن ابی شیبہ، قتیبہ بن سعید، اسحاق بن راہویہ وغیرہ شامل ہیں۔ امام ابن حجر کے اندازے کے مطابق ان کے شیوخ کی تعداد تین سو سے زائد ہے۔

شاگرد: آپ کے حلقۂ درس میں ہزاروں لوگ شریک ہوتے ابو عبد الرحمان نسائی اور احمد بن محمد نے آپ سے روایت کی ہے اور امام ترمذی اور امام نسائی جیسے ائمہ حدیث کا شمار آپ کے شاگردوں میں ہوتا ہے۔

علم و فضل: آپ فقہ اور علم حدیث میں لگے رہتے، زاہد متقی، عابد اور پرہیز گار تھے۔ علماء نے ان کو مختلف مسلکوں میں شمار کیا ہے لیکن آپ کا رجحان حنبلی مسلک کی طرف تھا۔

آپ کو بے شمار احادیث یاد تھیں۔ احادیث نبوی ﷺ کے ساتھ ساتھ متن اور اسناد پر بھی اچھی نظر تھی۔ آپ کو عالم حدیث کہا جاتا ہے۔ لیکن فقہ پر عبور رکھتے تھے اسی وجہ سے اپنی کتاب میں احکام و مسائل سے متعلق احادیث جمع کی ہیں اور تفسیر کے علم سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ موسیٰ بن ہارون فرماتے ہیں کہ ''ابو داؤد کو اللہ نے دنیا میں حدیث کے لیے اور آخرت میں جنت کے لیے پیدا کیا ہے۔ میں نے ان سے افضل کسی شخص کو نہیں دیکھا'' ابو بکر خلال کہتے ہیں کہ ''ابو داؤد اپنے زمانے میں حدیث کے امام ہیں اور کوئی ان کے مرتبہ کو نہیں پہونچا'' محمد بن اسحاق الصاغانی کہتے ہیں کہ ''علم حدیث ابو داؤد کے لیے اس طرح نرم کر دیا گیا ہے جیسے داؤد علیہ السلام کے لیے لوہا نرم کر دیا گیا تھا''

تصانیف

امام ابو داؤد نے بہت سی کتابیں لکھیں۔ مثلاً کتاب السنن، المراسل، کتاب الناسخ والمنسوخ، کتاب المسائل، کتاب فضائل الانصار، مسند مالک بن انسؓ، کتاب

التفسیر، کتاب نظم القرآن، کتاب فضائل القرآن اور کتاب الدعاء وغیرہ۔

سنن ابی داؤد: امام ابو داؤد کی مشہور تالیف سنن ابو داؤد ہے آپ نے اپنی کتاب میں صحیح یا حسن سے کم درجہ کی حدیث نہیں لی ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ کے سامنے جب یہ کتاب پیش کی گئی تو انہوں نے اس کو بہت پسند کیا۔ ابن عربی کہتے ہیں کہ اس کتاب میں وہ جامعیت ہے کہ اگر کسی کے پاس یہ کتاب اور قرآن ہو تو پھر اسے ضروریات دین جاننے کے لیے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ امام ابو داؤد نے فقہاء کے استدلال کو اس کتاب میں جمع کرنے کی کوشش کی ہے اور فرماتے ہیں کہ میری اس کتاب میں مالک، ثوری اور شافعی وغیرہ کے مذاہب کی بنیادیں ہیں۔ علامہ ابن قیم کہتے ہیں کہ امام موصوف نے ایسی کتاب لکھی جو مسلمانوں کے درمیان حکم ثابت ہوئی اور اختلافی مسائل میں فیصلہ کن بن گئی۔

خصوصیات

۱۔ امام صاحب نے ایک سند میں مختلف اسانید کو بیان کیا ہے۔ اور کبھی ایک متن میں مختلف متن جمع کر دیئے ہیں پھر ہر حدیث کے الفاظ کا اختلاف ظاہر کیا ہے۔

۲۔ لمبی حدیثوں کو مختصر الفاظ میں بیان کیا ہے تاکہ سننے والے تھک نہ جائیں۔

۳۔ دو یا تین حدیثوں کو ایک ہی باب میں ذکر کیا ہے لیکن اس کا مقصد کسی خاص بات کو سمجھانا ہوتا ہے۔ اور کسی خاص نقطہ نظر کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے۔

۴۔ کبھی کبھی ایک ترجمہ کے تحت مختلف روایات کو جمع کر دیا ہے۔

۵۔ کبھی ترجمہ اس طرح کرتے ہیں کہ ترجمہ کے الفاظ کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں مقصد یہ ہوتا ہے کہ احادیث سے ثابت شدہ حکم کے اندر یہ چیزیں بھی شامل ہیں۔

۶۔ سنن ابو داؤد میں ایک ثلاثی حدیث بھی ہے جو محدثین کے نزدیک بہت

اہمیت رکھتی ہے۔

۷۔ آپ کے عہد میں عباسی حکومت پر ایرانی اثرات غالب ہونے کی وجہ سے آپ نے ملت اسلامیہ کو عجمی اثرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی ہے اور اس مقصد کے لیے کتاب الآداب کو اہم درجہ دیا ہے۔

امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی ۵ لاکھ حدیثیں لکھی ہیں ان میں سے منتخب کر کے اس سنن ابوداؤد میں ۴ ہزار ۸ سو حدیثیں جمع کیں ہیں۔ انسان کو دین کے سمجھنے اور اس پر چلنے کے لیے ان میں سے چار حدیثیں کافی ہیں۔

۱۔ ''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے''

۲۔ ''کسی شخص کے اچھے ہونے کی نشانی یہ ہے کہ وہ بے کار کی باتوں کو چھوڑ دے''

۳۔ ''مومن اس وقت تک مومن نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے''

۴۔ ''حلال وحرام دونوں واضح ہیں اور جو کچھ اس کے درمیان ہیں وہ مشکوک ہے بس جو شخص شبہات سے بچ گیا اس نے اپنے دین کو بے داغ رکھا۔''

ان احادیث کے کافی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ پہلی حدیث عبادات کی درستگی کے لیے ہے۔ دوسری حدیث زندگی کے اوقات کی حفاظت کے لیے ہے۔ تیسری پڑوسیوں، رشتہ داروں اور دوسرے لوگوں کے حقوق کے متعلق ہے۔ چوتھی حدیث ایسے مسائل کے لیے ہے جن میں علماء کو اختلاف ہوتا ہے اس سلسلے میں واضح راستہ پیش کرتی ہے۔ غرض یہ چاروں حدیثیں شریعت کے اصول وکلیات جاننے کے لیے ایک استاد و شیخ کا درجہ رکھتی ہیں۔

۸۔ سنن ابی داؤد میں ۶۰۰ مراسیل بھی ہیں جمہور امت کے نزدیک مرسل

حدیث کو دین میں حجت کا درجہ حاصل ہے۔

سنن ابوداؤد کو ان کے متعدد شاگردوں نے روایت کیا ہے۔ جن میں چار مشہور ہیں۔

۱۔ ابوعلی محمد بن احمد بن عمر تو بودی ۳۲۱ھ

۲۔ ابوبکر بن محمد بن عبدالرزاق ۳۴۵ھ

۳۔ حافظ ابوعیسیٰ اسحاق بن موسیٰ بن سعید رملی ۳۱۷ھ

۴۔ حافظ ابوسعید احمد بن محمد بن زیاد (ابن الاعرابی) ۳۴۰ھ

سنن ابوداؤد کی متعدد شرحیں اور حواشی و مستخرجات لکھے گئے ہیں جن میں مشہور یہ ہیں۔

۱۔ معالم السنن۔ ابراہیم للخطابی ۳۸۸ھ

۲۔ مرقات السعود۔ سیوطی

۳۔ شرح سنن ابوداؤد۔ قطب الدین ابوبکر بن احمد الشافعی ۷۵۲ھ

۴۔ شرح سنن ابوداؤد۔ ابوزرعہ ۸۲۶ھ

۵۔ تہذیب السنن۔ ابوبکر لابن قیم جوزی ۷۵۱ھ

۶۔ بذل المجہود۔ خلیل احمد سہارنپوری

۷۔ غایۃ المقصود۔ شمس الحق عظیم آبادی

۸۔ مرقات الصعود۔ جلال الدین سیوطی ۹۱۱ھ

۹۔ شرح نووی۔ ابوزکریا محی الدین بن شرف نووی ۶۷۶ھ

☆☆☆

امام نسائیؒ

(ولادت ۲۱۵ھ۔ وفات ۳۰۳ھ)

نام ونسب: ابوعبدالرحمان احمد بن شعیب النسائی کا نام احمد اور کنیت ابوعبد الرحمان تھی۔ آپؒ کی پیدائش خراسان کے شہر نسا میں ہوئی جو مرو کے قریب واقع ہے جہاں تاریخ اسلام کے مشہور علماء وفضلاء پیدا ہوئے۔

ابتدائی حالات: امام نسائی بڑے شکیل ووجیہ تھے۔ ابتدائی حالات کی تفصیل موجود نہ ہونے کی وجہ سے اندازہ ہے کہ ابتدائی تعلیم خراسان میں ہی ہوئی کیونکہ اس زمانہ میں خراسان علم وفن کا مرکز تھا۔ وقت کے مشہور علماء اور محدثین کی خدمت میں حاضر ہوکر علم حدیث حاصل کیا۔ اور اس سلسلے میں خراسان، حجاز، عراق، شام، مصر اور جزیرہ کا سفر کیا اور آخر میں مصر میں قیام فرمایا۔

اساتذہ وشیوخ: ۱۵ر سال کی عمر میں سب سے پہلے قتیبہ بن سعید متوفی ۲۴۰ھ کے پاس بلخ میں حاضر ہوئے اور ان کی خدمت میں ایک سال دو مہینہ تک رہے۔ آپ نے جن اساتذہ سے حدیث شریف کی سماعت کی ان میں اسحاق بن

راہویہ، محمد بن نصر، علی بن حجر، یونس بن عبد الاعلی، محمد بن بشار، ہناد بن سرّی، محمد بن غیلان، امام ابو داؤد، سلیمان بن اشعث۔ امام بخاریؒ ابو زرعہ رازی، اور ابو حاتم رازی وغیرہ شامل ہیں۔

شاگرد: امام نسائی کے تلامذہ میں ان کے صاحب زادے عبد الکریم کے علاوہ ابو بکر احمد بن محمد اسحاق، حسن بن رشیق، ابراہیم بن محمد صالح، ابو القاسم طبرانی، محمد بن معاویہ، محمد بن قاسم اندلسی، ابو جعفر طحاوی اور ابو عوانہ مشہور ہیں۔

زہد وتقوی: امام نسائی نہایت پاکیزہ زندگی گذارتے عابد وزاہد تھے اور ہر وقت خوف الٰہی طاری رہتا ایک دن چھوڑ کر روزہ رکھتے۔ اکثر حج کے لیے تشریف لے جاتے آپ امیر مصر کے ساتھ جہاد میں بھی شریک ہوئے۔ سنت کی شدت سے پیروی کرتے اور بدعت کی روک تھام کے لیے کوشش کرتے کچھ دنوں تک حمص کے قاضی بھی رہے۔ ابن الحداد شافعی کہتے ہیں کہ ''میں نے اپنے اور خدا کے درمیان نسائی کو واسطہ بنایا ہے'' دیگر علماء ومحدثین نے بھی امام موصوف کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ امام دارقطنی فرماتے ہیں کہ ''نسائی اپنے زمانے کے تمام محدثین سے بلند مرتبہ تھے۔''

وفات: امام نسائی کی وفات بہت ہی مظلومانہ حالت میں ہوئی۔ امام نسائی کی شہرت ومقبولیت کی وجہ سے ان کو مصر میں پریشان کیا گیا اس لیے ۳۰۲ھ میں فلسطین کے مقام رملہ آگئے جہاں ان کا انتقال ہوا۔ بعض مؤرخین کہتے ہیں کہ انہوں نے مکہ میں دفن ہونے کی خواہش کی تھی جو پوری ہوئی چنانچہ ۸۸ سال کی عمر میں ۳۰۳ھ میں مکہ میں وفات ہوئی اور صفا ومروہ کے درمیان سپرد خاک کئے گئے۔

تصنیفات

امام نسائی نے فن حدیث اور علل پر کئی کتابیں لکھیں جن میں سنن الکبریٰ سنن

الصغریٰ، خصائص علی، مسند علی، مسند مالک، مسند منصور بن زادان، فضائل صحابہ اسماء الرواۃ والتمیز بینہم، کتاب الضعفا اور کتاب الجرح والتعدیل وغیرہ اہم ہیں۔

سنن نسائی شریف: امام نسائی نے سب سے پہلے سنن کبریٰ لکھی اور اسے امیر رملہ کی خدمت میں پیش کیا۔ امیر وقت نے ان سے پوچھا کہ اس کتاب میں جتنی حدیثیں ہیں کیا وہ سب صحیح ہیں؟ انہوں نے کہا نہیں بعض صحیح ہیں اور بعض حسن ہیں۔ امیر نے کہا میرے لیے ایک ایسا مجموعہ مرتب کردیں جس میں صرف صحیح احادیث ہوں۔ اس کے بعد انہوں نے سنن صغریٰ تالیف کی اس کو سنن مجتبیٰ بھی کہتے ہیں۔ یہ سنن صغری سنن نسائی کے نام سے مشہور ہوکر صحاح ستہ میں شامل ہوئی۔

خصوصیات

۱۔ انہوں نے ایک ہی حدیث کو الگ الگ ابواب میں بیان کرکے اس سے مختلف مسائل نکالے ہیں یہ بخاری کا انداز ہے۔ امام مسلم کی طرح حدیث کے مختلف سلسلوں کو اختلاف الفاظ کے ساتھ ایک جگہ روایت کرتے ہیں۔ آپ نے امام ترمذی کی طرح احادیث پر فنی نقطہ نظر سے بحث کی ہے اور راوی کے نام ونسب کا تفصیلی تعارف پیش کیا ہے۔ اور امام داؤد کی طرح احکام والی احادیث کی تدوین پر خصوصی دھیان دیا ہے۔

۲۔ سنن میں کہیں کہیں مشکل الفاظ کے معنی بھی بیان کردیئے ہیں اور اگر حدیث کے متن یا سند میں کہیں شبہ ہوا ہے تو اس کو بھی بیان کردیا ہے۔

۳۔ اسی طرح کسی موضوع پر اگر صحیح حدیث نہ مل سکی تو کم درجے کی حدیث بیان کرکے اس کا ضعف بھی بیان کردیا ہے۔

۴۔ حدیث کی علت پر تنبیہ کرتے ہوئے کہیں کہیں اپنی رائے بھی پیش

کرتے ہیں۔

۵۔امام نسائی کی شرائط اگرچہ بخاری و مسلم سے بھی سخت ہیں لیکن اس کے باوجود کمزور احادیث کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔

سنن کے بارے میں حافظ محدث ابوالحسن مغامری متوفی ۴۰۳ھ فرماتے ہیں کہ تمام محدثین کی جمع کردہ احادیث پر نظر ڈالو گے تو جس حدیث کی نسائی نے تخریج کی ہوگی وہ دوسروں کی روایت کردہ حدیث کے مقابلہ میں صحت سے زیادہ قریب ہوگی۔ حافظ ابوعلی نیشاپوری کا قول ہے کہ ''انھیں بغیر کسی تقابل کے حدیث میں امانت کا درجہ حاصل ہے۔''

صحاح ستہ کے مقابلہ سنن نسائی کی شرحیں اور تعلیقات کم لکھی گئی ہیں اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ علماء کی توجہ حدیث کے دوسرے مجموعوں کی طرف صرف ہوئی ہے۔ لیکن پھر بھی کچھ شرحیں درج ذیل ہیں۔

۱۔علامہ جلال الدین سیوطی المتوفی ۹۱۱ھ نے اس پر زہر الربی علی المجتبیٰ تعلیق لکھی۔

۲۔دوسری تعلیق یا حاشیہ محمد بن عبدالہادی سندی المتوفی ۱۱۳۸ھ کی ہے۔

۳۔تیسری شرح عمر بن علی بن محمد متوفی ۸۰۴ھ کی ''شرح الملقن'' کے نام سے ہے۔

۴۔علامہ ابوالحسن علی بن عبداللہ متوفی ۵۶۷ھ نے ''الامعان فی شرح سنن النسائی''، لکھی۔

۵۔شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب نے بھی اس پر شرح لکھی جس میں مولانا خلیل احمدؒ اور مولانا محمد یحیٰ وغیرہ کے افادات بھی آ گئے ہیں۔

☆☆☆

امام ابن ماجہؒ

(ولادت ۲۰۹ھ۔ وفات ۲۷۳ھ)

نام ونسب: ابوعبداللہ محمد بن یزید بن ماجہ کا نام محمد کنیت ابوعبداللہ ہے۔ آپ کی پیدائش ۲۰۹ھ میں قزوین ایران میں ہوئی آپ غیر عرب تھے لیکن عرب کے مشہور قبیلہ ربیعہ سے تعلقات کی وجہ سے ربعی مشہور ہوئے۔

ابتدائی حالات: آپ کا دور عباسی حکومت کے عروج کا زمانہ تھا اس وقت قزوین میں بڑے بڑے علماء موجود تھے۔ مثلاً محمد بن ابی خالد، ابوبکر قزوینی، ابوبکر بن ابی شیبہ، ہارون بن موسیٰ بن حیان تمیمی، ہہل بن اسحاق، عبداللہ بن معاویہ اور ہشام بن عمارہ وغیرہ جن سے حدیثیں سنیں۔ اس کے علاوہ امام مالک کے شاگردوں سے آپ نے علم حدیث حاصل کیا۔ حصول علم حدیث کے لیے کوفہ، بصرہ، بغداد، مکہ، شام، رے اور مصر کا سفر کیا اور جن اساتذہ سے استفادہ کیا ان میں جبارہ بن المفلس، ابراہیم بن المنذر، ہشام بن حماد اور ابن نمیر وغیرہ خاص ہیں ابوبکر بن ابی شیبہ ان کے خصوصی استاد تھے۔

شاگرد: ابن ماجہ کے شاگردوں میں ابراہیم بن دینار، احمد بن ابراہیم، اسحاق بن ابوبکر، عیسیٰ الابہری، ابوالحسن بن قطان، ابوجعفر اور محمد بن عیسیٰ مشہور ہیں۔

ابن ماجہ کے مسلک کے متعلق متعین طور پر کچھ کہنا مشکل ہے شاہ ولی اللہ کے

نزدیک ان کا رجحان امام احمدؒ کی طرف تھا۔ علامہ طاہر جزائری فرماتے ہیں کہ ابن ماجہؒ علماء وائمہ میں سے کسی کے مقلد نہ تھے بلکہ ائمہ حدیث امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے قول کی طرف رجحان تھا۔ گویا کہ اہل عراق کے مذہب کے مقابلہ میں ان کا رجحان اہل حجاز کی طرف تھا۔

ابن ماجہ کے حالات زندگی تاریخ کی کتابوں میں تفصیل سے نہیں ملتے لیکن انہوں نے جو علمی سرمایہ چھوڑا ہے وہ ان کی شہرت اور یادر کھنے کے لیے کافی ہے۔

وفات: ۶۴ رسال کی عمر میں شہر قزوین میں ۲۲ ر رمضان المبارک ۲۷۳ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

سنن ابن ماجہ۔خصوصیات

۱۔ تفسیر اور تاریخ کے علاوہ حدیث میں سنن ابن ماجہ آپ کی معروف تالیف ہے یہ کتاب چار ہزار احادیث پر مشتمل ہے۔

۲۔ اس کتاب میں ثلاثی احادیث بھی کافی تعداد میں ملتی ہیں۔

۳۔ اس کتاب کو اکثر علماء ومحدثین صحاح ستہ میں شمار کرتے ہیں۔

ابن ماجہ میں ایک حدیث منکر بلکہ موضوع نقل کی گئی ہے جس کی وجہ سے بعض لوگ اسے صحاح ستہ میں شمار نہیں کرتے۔ علامہ ابن خلکان نے ابن ماجہ کے بارے میں لکھا ہے کہ انہیں فن حدیث میں امامت کا درجہ حاصل ہے۔ ابن ماجہ کا بیان ہے کہ یہ کتاب حافظ ابو زرعہ کے سامنے پیش کی تو انہوں نے کہا کہ اس میں ۳۰ سے زیادہ ضعیف احادیث نہیں ہیں۔

۴۔ ابن ماجہ کو حسن ترتیب اور احادیث کی تکرار نہ ہونے کے لحاظ سے دوسری کتابوں کے مقابلہ میں امتیاز حاصل ہے۔

۵۔ سنن ابن ماجہ کی ترتیب وتبویب فقہ کے مسائل کے لحاظ سے ہے۔

۶۔اس میں ایسی بہت سی نادر احادیث ہیں جو دوسری حدیث کی کتابوں میں نہیں ہیں حالانکہ یہ ضعیف ہیں حدیث کے ساتھ ساتھ ابن ماجہ نے مختلف شہروں کی مخصوص روایات کی نشاندہی بھی کردی ہے۔احادیث کے ذیل میں بعض ایسے واقعات کی طرف بھی اشارہ کر جاتے ہیں۔جن سے اس عہد کے مسلمانوں کے اس تعلق کا پتہ چلتا ہے جوانہیں حدیث نبوی ﷺ سے تھا۔

۷۔اس میں پانچ ثلاثی روایات ہیں جن کی روایت سند ایک ہے۔

۸۔ابن ماجہ میں احادیث میں تکرار نہیں ہے اس کے باوجود تعداد حدیث دوسری حدیث کی کتابوں سے زیادہ ہے۔

۹۔سنن ابن ماجہ میں بتیس کتابیں پندرہ سو ابواب کے تحت چار ہزار احادیث بیان کی گئی ہیں۔

علماء نے اس کتاب پر جو شرح وحواشی لکھی ہیں ان میں درج ذیل یہ ہیں۔

۱۔شرح ابن ماجہ۔حافظ علاء الدین مغلطائی ۷۶۲ھ

۲۔شرح ابن ماجہ۔ابن رجب زبیری حنبلی ۷۹۵ھ

۳۔ماتمس الیہ الحاجۃ علی سنن ابن ماجہ۔شیخ سراج الدین عمر بن علی الملقن ۸۰۴ھ

۴۔الدیباچہ۔شیخ کمال الدین محمد بن موسیٰ ۸۰۸ھ

۵۔نور مصباح الزجاجۃ۔شیخ علی بن سلیمان مالکی ۹۱۱ھ

۶۔شرح سنن ابن ماجہ۔ابوالحسن محمد بن عبدالہادی سندی ۱۱۸۳ھ

۷۔حاشیہ بر سنن ابن ماجہ۔فخر الحسن گنگوہی

۸۔مفتاح الماجہ۔شیخ محمد علی

☆☆☆

ہندوستان میں علم حدیث

عرب تاجروں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بستیاں قائم کی تھیں لیکن ان کا تعلیم سے کوئی خاص تعلق نہ تھا۔ تیسری صدی کی ابتداء سے آٹھویں صدی ہجری تک جنوبی ہند، کالی کٹ اور مہاراشٹر میں مسجدیں و مدرسے قائم تھے۔ شمالی ہند کے مسلمان فقہ حنفی اور جنوبی ہند کے فقہ شافعی پر عمل کرتے تھے۔ شافعیوں کو علم حدیث سے خصوصی دلچسپی تھی۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد سے ہی علوم کا چرچا عام ہو گیا تھا۔ دہلی میں بہت سے علماء موجود تھے ساتویں صدی ہجری کے آغاز میں جب احمد صغانی ۶۱۵ھ بدایوں سے دہلی آئے تو یہاں محدثین کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔

آٹھویں صدی کے شروع میں دکن میں فیروز شاہ بہمنی ۸۰۰ھ تا ۸۲۵ھ اور گجرات میں مظفر شاہ ثانی ۹۱۷ھ تا ۹۳۲ھ جیسے حکمرانوں نے علماء کو دعوت دے کر اپنے دربار سے وابستہ کیا۔ ایران، عرب اور ترکی سے علماء نے آکر ان مقامات پر سکونت اختیار کی۔ حجاز و مصر کے محدثین نے حدیث اور نبی کریم ﷺ سے عقیدت و محبت کا اظہار کیا اور ان علاقوں میں علم حدیث کی اشاعت میں حصہ لیا۔

دسویں صدی عیسوی میں دہلی، یوپی اور پنجاب میں مولانا اسماعیل لاہوری

متوفی ۹۸۰ھ اور حاجی ابراہیم قادری متوفی ۱۰۰۱ھ جیسے چند محدثین نظر آتے ہیں۔ ہندوستان کے ساحلی علاقے میں علوم کا چرچا عام تھا محمد بن یزدان خواجگی شیروانی امیر سید عبدالاول، شیخ عبدالملک عباسی، شیخ محمد طاہر اور حکیم عثمان صدیقی جیسے محدثین موجود تھے۔

شمالی ہندوستان سے محمد بن تعلق نے علماء کو دور دراز حصوں میں بھیج دیا تھا جس کی وجہ سے اس علاقے میں علمی سرگرمیاں تقریباً ختم ہوگئی تھیں اس وقت کے مشہور علماء میں معین الدین عمرانی، ضیاء الدین بخشی، مولانا احمد تھانیسری، ضیاء الدین برنی وغیرہ ہیں۔ فیروز تغلق نے اپنے عہد میں علماء کو جمع کرنے کی کوشش کی لیکن سیاسی ابتری کی وجہ سے کامیابی نہ مل سکی۔

ہندوستان میں علوم وفنون کے دوسرے دور کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب ایران سے شاہ اسماعیل صفوی کی حکومت سے تنگ آکر یا عراق سے سقوط بغداد کی وجہ سے علماء اور محدثین نے ہندوستان کا رخ کیا اور یہاں کے حکمرانوں نے بھی علماء کا استقبال اور سرپرستی کی لہذا علم حدیث کے حصول کے .لیے طلباء نے ہندوستان کے مختلف مقامات کے سفر کیے اور اس کے بعد حرمین کے علماء سے استفادہ کیا ان میں عبد الأول حسینی، جمال اللہ گلبرگوی، تقی الدین فہد، ابوالفتح الراغی اور احمد بن ابراہیم وغیرہ نے السخاوی سے استفادہ کیا۔

شیخ احمد ناگوری کے زمانے میں ناگور علم حدیث کا مرکز تھا، امام بخاری، امام ثعلبی مقدسی، امام واقدی وغیرہ کی کتب حدیث عام تھیں۔ مدرسہ فیروز شاہی میں صحاح ستہ کا درس دیا جاتا تھا۔ صحیح مسلم کا نسخہ سکندر لودی کے لیے لکھا گیا۔ علاء الدین کے عہد حکومت (۶۹۳ھ) میں تو علماء کی ایک بڑی تعداد دہلی میں موجود تھی۔ بقول برنی یہ علماء رازی اور غزالی سے کم نہیں تھے حد یہ کہ بخارا، سمرقند، خوارزم اور عراق کے علماء کی

تصانیف اس وقت تک معتبر نہیں سمجھی جاتی تھیں جب تک کہ علماء ہندان کی تصدیق نہ کردیں۔ مولانا عمادالدین حسام، مولانا حمیدالدین، مولانا مقریزی اوران کے بیٹے محفل میں وعظ کیا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں امام ابن تیمیہ کے شاگرد امام عبدالعزیز ہندوستان دیبل (سندھ) آئے۔ عبدالحق محدث دہلوی نے حجاز میں عبدالوہاب متقی سے استفادہ کر کے اپنا مدرسہ قائم کیا اس وقت شمالی ہند میں علم حدیث کا چراغ تقریباً مدھم پڑ چکا تھا انھوں نے درس حدیث کو عام کر کے روشنی کی نئی شمع روشن کی۔ علم حدیث کا مرکز گجرات سے منتقل ہو کر پھر دہلی آ گیا اور اس کے بعد علم حدیث پر جو بھی کام ہوا اس کا سہرا شیخ عبدالحق محدث دہلوی کو جاتا ہے۔ ان کے بعد شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے شاگردوں نے علم حدیث کو عروج دیا اور یہ سلسلہ تیرہویں صدی ہجری میں دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور کے قیام تک جاری رہا۔

☆☆☆

امام احمد حسن صغانی لاہوریؒ

(۵۷۷ھ-۶۵۰ھ)

ابتدائی زندگی: رضی الدین حسن بن محمد بن حسن بن حیدر قرشی عمری حنفی سلسلہ نسب ہے صغانی کے نام سے مشہور ہیں صفر ۵۷۷ھ بمطابق جولائی ۱۱۸۱ء کو لاہور میں پیدا ہوئے تھے۔آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد محمد بن حسن سے حاصل کی جو ایک ممتاز عالم تھے۔آپ کی یادداشت بچپن ہی سے بہت اچھی تھی۔آپ نے کم عمری ہی میں ابو عبید القاسم بن السلام متوفی ۲۴۰ھ کی ''غرائب'' زبانی یاد کر کے ایک ہزار دینار انعام حاصل کیا تھا۔

تحصیل علم: انھوں نے پچیس سال کی عمر میں فقہ حنفی میں مہارت حاصل کرلی تھی۔ سلطان قطب الدین ایبک نے ان کو لاہور کا قاضی بنانے کی پیشکش کی لیکن انھوں نے انکار کردیا آپ نے اعلی تعلیم حاصل کرنے کے لیے عراق اور حجاز کے کئی سفر کیے اور بڑی یکسوئی ومحنت کے ساتھ اس وقت کے نامور علماء سے علوم حدیث اور لسانیات کی تعلیم حاصل کی بغداد میں ''نظام المرغینانی اور سعید بن عذاز سے تعلیم حاصل کی ۶۱۰ھ بمطابق ۱۲۱۴ء میں حجاز میں ایک محدث کی حیثیت سے مقبول ہوئے۔ تین

سال بعد مکہ میں یاقوت حموی متوفی ۶۲۶ھ سے آخری بار ملاقات کی۔ برہان الدین ابہری سے بھی مکہ میں استفادہ کیا۔ بغداد پہنچے تو خلیفہ ناصر نے خلعت عطا کی اور انھوں نے عباسی خلفاء کی سرپرستی میں بغداد میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ۶۱۷ھ بمطابق ۱۲۲۳ء میں خلیفہ ناصر نے سلطان التمش کے دربار میں اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔ انھوں نے بیس سال تک یہ خدمات انجام دیں۔ ۶۲۱ھ بمطابق ۱۲۲۷ء میں خلیفہ ناصر کے انتقال کی وجہ سے اچانک بغداد چلے گئے۔ خلیفہ مستنصر نے اسی سال ان کو پھر دہلی میں سفیر مقرر کیا۔ ۶۳۷ھ بمطابق ۱۲۳۹ء میں امام صغانی رضیہ سلطانہ کے قتل کے بعد بحرانی کیفیت کی وجہ سے واپس بغداد چلے گئے۔

علمی زندگی: امام صغانی نے اپنی زندگی علم حدیث اور علم اللسان پر کتاب لکھنے اور درس دینے میں وقف کر دی۔ ان کے یہاں شاگردوں کا ہجوم لگا رہتا۔ محدث شرف الدین دمیاطی جو امام ذہبی کے شیخ تھے اور صغانی کے شاگردوں میں سے تھے۔

وفات: امام صغانی ۶۵۰ھ بمطابق ۱۲۵۲ء نے اپنی رہائش گاہ جو حریم الظاہری بغداد میں تھی وفات پائی۔ وصیت کے مطابق ان کی میت کو مکہ معظّمہ میں لاکر دفن کیا گیا۔

علمی خدمات: آپ علم حدیث، لسانیات اور علم فقہ کے مستند عالم تھے۔ آپ نے مکہ، ہند، یمن اور بغداد میں تقریباً چار سو احادیث سنیں۔ آپ کی تصانیف کی تعداد تقریباً ۳۲ ہے، ان کا بڑا حصہ علم لسانیات سے متعلق ہے۔ آپ کا مقصد ان صحیح احادیث نبوی کو عام بنانا تھا جن کو پانچویں صدی ہجری سے نظر انداز کیا جا رہا تھا۔ اس وقت حنفی اور شافعی مذہب کے ماننے والوں کے درمیان مناظرہ ہوا کرتا تھا جن کی صدارت کوئی

بڑا سرکاری عہدیدار کرتا تھا اور دونوں مسلک برتری کو ثابت کرنے کے لیے دلائل پیش کرتے اور جھگڑے کر کے ایک دوسرے کو لعن طعن کرتے اور من گھڑت احادیث بیان کرتے۔ علم فقہ پر توجہ مرکوز ہونے کی وجہ سے ان احادیث کی اشاعت کی گئی خاص کر قصہ گو صوفیوں اور مفسرین نے اس کا خوب استعمال کیا اس رجحان کو ختم کرنے میں اما صغانی اور امام ابن الجوزی کی کوششیں یقیناً قابل قدر ہیں۔

علم حدیث میں خدمات: عباسی خلیفہ مستنصر باللہ کے لیے انھوں نے مشہور و معروف کتاب ''مشارق الانوار'' لکھی مشارق الانوار میں ۲۲۵۳ احادیث شامل ہیں جو صحیح بخاری و صحیح مسلم سے منتخب کی گئی ہیں ان احادیث میں سے ۳۲۷ صرف صحیح بخاری سے اور ۸۷۵ صحیح مسلم سے ہیں اور بقیہ ۱۰۵۱ احادیث دونوں میں موجود ہیں۔ پوری سند بیان نہیں کی گئی ہے بلکہ صرف صحابیوں کے نام درج ہیں۔

امام صغانی کی وفات کے بعد ۷۵ سالوں کے اندر اندر مشارق الانوار کی پہلی شرح بغداد کے مدرسہ المستنصریہ میں علاء الدین یحیٰ بن عبد اللطیف نے لکھی اور قریب قریب اسی زمانہ میں شمس الدین اودھی متوفی ۷۴۹ھ، جو حضرت نظام الدین اولیاؒ کے شاگرد تھے۔ مشارق الانوار کی دوسری شرح لکھی۔

علم حدیث میں امام صغانی کا اہم کام یہ ہے کہ آپ نے درج ذیل موضوع کے متعلق جھوٹی احادیث کی نشاندہی کی۔ مثلاً

۱۔ کسی شخص کا نام احمد یا محمد رکھنے کے متعلق احادیث

۲۔ چاول، حریرہ، لہسن، بینگن اور پیاز وغیرہ کے بارہ میں احادیث

۳۔ کچھوا، ریچھ، چرخ، چھپکلی وغیرہ سولہ قسم کے جانوروں کی تبدیلی ہیئت کے

بارے میں احادیث۔

۴۔مہینہ، دنوں اور راتوں کی خصوصیات سے متعلق احادیث۔

۵۔ماہ رجب کی فضیلت کے بارے میں احادیث۔

۶۔مسجدوں میں استعمال کی جانے والی قندیلوں، موم بتیوں اور چٹائیوں سے متعلق احادیث۔

امام صغانی نے حدیث کی صحت جانچنے کے اصول، شرائط، نوعیت، الفاظ اور معنی کے بارہ میں وضاحت کی اور احادیث گھڑنے والوں کی فہرست تیار کی ان میں ابوالدنیا الشیخ، الخراش، جعفر بن نسطور رومی، بشر، نعیم، تخشف بہ سند انس، رتن الہندی وغیرہ ہیں۔

تصانیف

آپ کی درج ذیل تصانیف مشہور ہیں۔

العباب، مشارق الانوار، مصباح الدجی من صحاح الحدیث الماثور، الشمس المنیرہ فی اصحاح الماثورہ۔ کشف الحجاب عن احادیث الشہاب، شرح بخاری، مختصر الوفیات، کتاب الضعفاء والمتروکین وغیرہ۔

☆☆☆

شیخ عبدالحق محدث دہلوی

(۹۵۸ھ-۱۰۵۲ھ)

خاندانی حالات: شیخ عبدالحق بن سیف الدین بن سعد اللہ ترکی بخاری دہلوی حنفی آپ کا سلسلہ نسب ہے آپ کے جداعلیٰ آغا محمد ترک بخارا کے رہنے والے تھے۔ تیرہویں صدی عیسوی میں سقوط بغداد کے بعد اپنے وطن کے حالات سے مایوس ہوکر آبائی وطن کو خیر آباد کہہ ترکوں کی ایک کثیر جماعت کے ساتھ دہلی آئے۔ اس وقت دہلی میں سلطان علاء الدین (۱۲۹۶ء تا ۱۳۲۶ء) حکمراں تھا۔ اس نے انھیں اعلیٰ عہدوں سے نوازا اور ان کو گجرات کی مہم پر روانہ کردیا۔ فتح گجرات کے بعد آپ نے وہیں سکونت اختیار کرلی۔ اللہ نے انھیں کثیر اولاد دی تھی۔ ۱۰۱/ اولادوں کے ساتھ آپ بہت ہی سکون سے زندگی گزار رہے تھے، لیکن ایک سانحہ میں ان کی ایک سو ایک اولادوں میں سے سو کا انتقال ہوگیا۔ ایک لڑکا ملک معز الدین باقی بچا، اس کو لے کر دہلی آگئے اور شیخ صلاح الدین سہروردی کی خانقاہ میں بیٹھ گئے، جہاں ۷۳۹ھ بمطابق ۱۳۳۸ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی نسل میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے والد ماجد شیخ سیف الدین کی پیدائش ہوئی جو آگے چل کر نیک اور پرہیزگار عالم دین ہوئے۔ شیخ سعد اللہ درویش صفت انسان تھے، اس لیے ان کا اثر بیٹے پر بھی پڑا۔

ابتدائی زندگی: شیخ سیف الدین کے یہاں ۹۵۸ھ مطابق ۱۵۵۱ء میں شیخ عبدالحق پیدا ہوئے یہ وہ دور تھا جب محمد جونپوری کی مہدوی تحریک عروج پر تھی اور شیر شاہ سوری حکمراں تھا۔ ان کی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۹۶۳ھ مطابق ۱۵۵۵ء سے ۹۸۵ھ مطابق ۱۵۷۷ء تک انھوں نے اپنے والد محترم سے ابتدائی تعلیم حاصل کی تعلیمی سلسلہ شروع ہونے کے دو ماہ میں ہی قرآن کریم ختم کیا اور سوا سال میں قرآن کریم حفظ کر لیا۔ عربی، فارسی، فقہ اور معقولات کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اس دور میں وسط ایشیاء سے بڑی تعداد میں فقہاء اور علماء دہلی میں آکر سکونت اختیار کر چکے تھے ان سے استفادہ کیا۔ دوسرا دور ۹۹۶ھ بمطابق ۱۵۸۸ء سے ۱۰۰۰ھ بمطابق ۱۵۹۲ء تک ہے اس دور کے شروع میں مکہ معظّمہ جا کر عبدالوہاب متقی سے فیض یاب ہوئے اور فقہ حنفی، علم حدیث، تصوف اور حقوق العباد کی تعلیم حاصل کی۔ حجاز جانے سے پہلے فتح پور سیکری میں فیضی اور مرزا نظام الدین احمد کے ساتھ رہے اس لیے درباری زندگی کی طرف مائل تھے تین سال تک عبدالوہاب متقی کے پاس رہے اس کے بعد انھوں نے دہلی واپس جانے کو کہا لیکن یہ اس اکبری عہد میں دہلی واپس نہیں آنا چاہتے تھے جب عبدالوہاب متقی نے بہت اصرار کیا تو طائف میں عبداللہ ابن عباسؓ کے مزار کی زیارت کی اور واپس دہلی آئے۔ ان کی زندگی میں ایسا انقلاب آیا کہ انھوں نے فیضی سے ملنے سے انکار کر دیا اور شمالی ہند کا پہلا مدرسہ جو قرآن و حدیث کی تعلیم کا مرکز تھا دہلی میں شروع کیا۔ اس کا مقصد شریعت و سنت کی تعلیم کے ذریعے دین الٰہی کے فتنے کو ختم کرنا تھا۔

تصوف کی طرف جھکاؤ: انھوں نے علوم ظاہری کے ساتھ ساتھ علوم باطنی کی تعلیم بھی اپنے والد سے حاصل کی تھی اس لیے طبیعت روحانی زندگی کی طرف مائل تھی۔

آپ نے قادریہ سلسلے کے مشہور بزرگ سید موسیٰ گیلانی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ان کے بعد ان کے بیٹے عبدالقادر جیلانی کے ہاتھ پر بیعت کی ان کے اشارہ پر دہلی میں خواجہ باقی باللہ کے ہاتھ پر بیعت کی جو احیائے سنت اور ردّ بدعت کا بیڑا اٹھائے ہوئے تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کا زمانہ دیکھا۔لیکن اپنے آپ کو دربار سے ہمیشہ دوُر رکھا۔ جہانگیر نے ان سے متاثر ہو کر بکروالا کی جاگیر پیش کی پہلے تو انکار کیا لیکن بہت اصرار پر قبول کر لیا۔اس کے آخری دنوں میں تعلقات خراب ہوئے تو اس نے ان کو لاہور چلے جانے کا حکم دیا۔ابھی کشمیر تک گئے تھے کہ جہانگیر کے انتقال کی خبر ملی تو دہلی واپس آ گئے۔

وفات: آپ کی وفات ۲۱/ربیع الاوّل ۱۰۵۲ھ مطابق ۲۹/جون ۱۶۴۲ء کو دہلی میں ہوئی۔ چورانوے سال دو ماہ عمر تھی خواجہ بختیار کاکی کے مزار کے قریب حوض شمسی کے کنارے دفن کیا گیا۔آپ کی وصیت کے مطابق آپ کے بیٹے انوار الحق نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔

علم حدیث میں خدمات

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے ایک ایسے دور میں جب کہ علم حدیث شمالی ہندوستان میں تقریباً ختم ہو چکا تھا اپنی مسلسل اور پر خلوص جدوجہد سے اس کو از سر نو زندہ کیا۔

۲۔احادیث کی کتابوں کو اپنے زمانے کے نصاب کا ایک لازمی حصہ بنا دیا خود اپنے مدرسہ میں کتب احادیث کے باقاعدہ درس کی شروعات کی۔

۳۔فارسی زبان میں کتب احادیث کو منتقل کرنے کی کوشش کی۔

۴۔شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے مشکوٰۃ شریف پر خصوصی توجہ دی اور اس کے

درس کا انتظام کیا۔

تصانیف

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے عمر کا بیشتر حصہ تصنیف و تالیف میں گزارا۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر تقریباً ساٹھ کتابیں لکھیں۔ ان کے پاس ایک ذاتی کتب خانہ تھا جس میں بڑی تعداد میں کتابیں موجود تھیں۔ آپ کی تصانیف درج ذیل ہیں۔

علم تفسیر پر تین کتابیں، علم قرأت پر ایک، علم حدیث پر تیرہ کتابیں، عقائد پر ایک، فقہ پر تین، تصوف پر دس، علم اخلاق پر چار، اعمال و درود پر پانچ، فلسفہ و منطق پر تین، تاریخ پر تین، سیرت پر سات، علم نحو پر دو، ذاتی حالات پر چار، خطبات پر ایک، مکاتیب پر دو اور ایک اشعار کا مجموعہ ہے۔

اخبار الاخیار، مشکوٰۃ کی شرح (اشعۃ اللمعات فی شرح المشکوٰۃ)، تکمیل الایمان وتقویت الایمان، رسالہ اقسام الحدیث، جامع البرکات منتخب شرح المشکوٰۃ، ذکر ملوک، شرح فتوح الغیب، ترجمۃ الاحادیث الاربعین، وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

☆☆☆

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

(۱۱۱۴ھ-۱۱۷۶ھ)

حالات زندگی: قطب الدین ابوعبدالعزیز احمد بن عبدالرحیم عمری حنفی دہلوی، جو شاہ ولی اللہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروقؓ سے مل جاتا ہے۔ اورنگ زیب کی وفات سے چار سال قبل بروز چہارشنبہ ۱۴ر شوال ۱۱۱۴ھ مطابق فروری ۱۷۰۳ء میں پھلت ضلع مظفرنگر میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد عبدالرحیم ایک مشہور عالم دین تھے اور فتاویٰ عالم گیر کے مرتبین میں شامل تھے۔ شاہ ولی اللہ نے پانچ سال کی عمر سے ہی تعلیم حاصل کرنا شروع کردی تھی اور سات سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کرلیا تھا۔ پندرہ سال کی عمر تک مدارس کی اعلیٰ تعلیم مکمل کرلی تھی۔ علم حدیث کی تعلیم اپنے والد شاہ عبدالرحیم سے اور مشکوٰۃ، شمائل نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحیح بخاری کا ایک حصہ افضل سیالکوٹی سے پڑھا۔ ۱۱۴۳ھ بمطابق ۱۷۳۰ء میں انھوں نے حرمین کا سفر کیا اور وہاں چودہ ماہ تک قیام کیا۔ ابوطاہر مدنی سے صحاح ستہ، مشکوٰۃ اور حصن حصین، اور وفداللہ مالکی مکی سے موطا امام مالک کا درس لیا۔ تاج الدین قلعی مکی، عمر بن احمد مکی سے بھی علم حدیث میں استفادہ کیا۔ ۱۱۴۶ھ میں دلی واپس آکر اپنے والد کے قائم کردہ مدرسہ رحیمیہ میں حدیث کا درس دینا

شروع کردیا۔ طلبا کے اضافہ کے پیش نظر محمد شاہ کے ذریعہ دی گئی وسیع عمارت میں جماعتیں منتقل کردی گئیں آپ اس مدرسہ میں تقریباً پچیس سال تک صحاح ستہ، موطا، مسند دارمی اور مشکوٰۃ کی تعلیم دیتے رہے اور علم حدیث کی تحصیل کا ایک نیا طریقہ رائج کیا جس کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ طالب علم کی فطرت میں تحقیق و تجسّس کی تڑپ پیدا کی جائے۔

طریقہ تدریس: آپ طلبا کو پہلے سے سبق پڑھ کر آنے کو کہتے پھر اس پر بحث کرتے طالب علموں کو بحث و مباحث کے طریقہ سے تعلیم دیتے۔ مسائل پر بحث کرتے وقت مذاہب اربعہ کے اختلافات کو کم کر کے پیش کرتے۔ خاص طور سے حنفی اور شافعی مسلک میں پائے جانے والے اختلافات کو دور کرنے کی کوشش کرتے بلکہ جن مسائل میں اتفاق رائے پایا جاتا اس کو واضح کرتے کسی کو دوسرے پر فوقیت نہ دیتے تاکہ ائمہ اربعہ اور ان کے مسالک کے بارے میں لوگوں میں احترام اور رواداری کا جذبہ پیدا ہو۔

شاگرد: ان کے خاص شاگردوں میں ان کے صاحبزادے عبدالعزیز، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، محمد عاشق پھلتی، خواجہ امین، خیر الدین سوائی، رفیع الدین مرادآبادی مشہور ہیں۔

وفات: ۲۹ر محرم ۱۱۷۶ھ (۱۷۶۲ء) کو دہلی میں وفات ہوئی۔ خونی دروازہ کے قریب قبرستان مہندیان میں دفن کیا گیا۔

تصنیفات

حجۃ اللہ البالغۃ، الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، الانصاف فی بیان سبب الاختلاف، ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء، اربعین، وثیقۃ الآخرۃ، الدرالثمین فی مبشرات النبی الامین، الفضل المبین فی المسلسل من حدیث النبی الامین، الارشاد الی مہمات الاسناد،

تراجم بخاری، المصفی، المسوی (شرح مؤطا)، آثار المحدثین، مکتوبات مع مناقب امام بخاری وابن تیمیہ وغیرہ۔

علم حدیث میں خدمات

شاہ صاحب قرآن مجید کے بعد حدیث کی چھ کتابوں میں مؤطا امام مالکؒ کو سب سے زیادہ صحیح اور معتبر خیال فرماتے۔ وہ وصیت نامے میں لکھتے ہیں کہ "طالب علم جب عربی سمجھنے کے قابل ہو جائے تو اسے مؤطا پڑھائی جائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مؤطا پڑھنے سے محروم رہ جائے، کیونکہ یہ کتاب علم حدیث کی صحیح اور اصل بنیاد ہے۔ جس کے مطالعہ میں سعادت اور برکت دونوں ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ حدیث کی تحصیل کے لیے حجاز تشریف لے گئے، ان کے بیٹے شاہ عبدالعزیز نے لکھا ہے کہ "میرے والد مدینہ منورہ سے علم حدیث لائے۔" چودہ ماہ حرمین شریفین میں رہ کر آپ نے سند حاصل فرمائی تھی۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے مدینہ منورہ میں اپنے استاد حدیث سے حجاز سے رخصت ہوتے وقت فرمایا تھا کہ "جو کچھ میں نے پڑھا تھا سب کچھ بھلا دیا سوائے علم دین یعنی علم حدیث کے۔"

شاہ ولی اللہؒ نے کتب حدیث کے طبقات بھی مقرر کیے تھے۔ طبقہ اوّل میں مؤطا امام مالک، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کو رکھا ہے اور طبقہ دوم میں سنن ابی داؤد، جامع ترمذی اور سنن نسائی کو رکھا ہے۔ طبقات کی یہ بحث آپ کی کتاب حجۃ اللہ البالغۃ میں موجود ہے۔

☆☆☆

اہم سوالات

۱۔ حدیث کی تعریف بیان کیجئے؟

۲۔ قرآن کی موجودگی میں حدیث کی اہمیت کو واضح کیجئے؟

۳۔ مندرجہ ذیل اصطلاحات حدیث کی تعریف بیان کیجئے؟

حدیث، صحابی، متن، راوی، سند، حدیث قدسی، مرفوع، ثلاثیات

صحیح، حسن، ضعیف، مشہور، غریب، شاذ، منکر وغیرہ

۴۔ تدوین حدیث کی مختصر تاریخ بیان کیجئے؟

۵۔ صحاح ستہ سے کیا مراد ہے ان میں کون کون سی کتب حدیث شامل ہیں؟

۶۔ مؤلفین صحاح ستہ اور ان کی کتب کا تعارف کرایئے؟

۷۔ ہندوستان میں علم حدیث کے فروغ پر روشنی ڈالئے؟

۸۔ امام احمد حسن صغانی لاہوری کے حالات زندگی اور علم حدیث میں ان کی خدمات پر روشنی ڈالئے؟

۹۔ عبدالحق محدث دہلوی کی حیات اور حدیث میں ان کی خدمات کا جائزہ لیجئے؟

۱۰۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کی حیات اور علم حدیث میں ان کی خدمات بیان کیجئے؟

☆☆☆

کتب برائے مطالعہ

۱۔ حدیث کا تعارف	محمد فاروق خاں
۲۔ تدوین حدیث	مولانا مناظر احسن گیلانی
۳۔ علم حدیث اور چند اہم محدثین	محمد سالم قدوائی
۴۔ حدیث کا درایتی معیار	مولانا تقی امینی
۵۔ تذکرۃ المحدثین	مولانا ضیاء الدین اصلاحی
۶۔ محدثین عظام اور ان کے کارنامے	مولانا تقی الدین ندوی
۷۔ علم حدیث میں پاک و ہند کا حصہ	ڈاکٹر محمد اسحاق مترجم شاہد حسین رزاقی
۸۔ مسلمان اور وقت کے تقاضے	مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی
۹۔ اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں	سید عبدالحئی حسینی مترجم ابوالعرفان ندوی
۱۰۔ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی	خلیق احمد نظامی
۱۱۔ شاہ ولی اللہ دہلوی۔ حیات وافکار	مرتبہ ظفر احمد نظامی
۱۲۔ دعوت وعزیمت	مولانا ابوالحسن علی ندوی
۱۳۔ کتابت حدیث	مولانا منت اللہ رحمانی

☆☆☆

باب سوم

فقہ اسلامی تعارف وتاریخ

تعریف: فقہ کے لغوی معنی فہم وتدبر اور سمجھنے کے ہیں۔

شریعت کی اصطلاح میں فقہ وہ علم ہے جس میں تفصیلی دلائل کے ذریعہ احکام شریعہ کو سمجھا جاتا ہے بحث کی جاتی ہے اور قوانین اخذ کئے جاتے ہیں علماء کے نزدیک فقہ کے معنی تحقیق وتفتیش کرنا اور کسی مسئلہ کو واضح وحل کرنا ہے۔ امام ابوحنیفہ کا قول ہے کہ ''حلال وحرام اور جائز وناجائز کو جاننے کا نام فقہ ہے۔''

فقیہ: جو عالم مآخذ شریعت (قرآن وحدیث) کی روشنی میں مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں انہیں فقیہ کہتے ہیں۔

فقہ کی ضرورت واہمیت

حضور اکرم ﷺ جس ہدایتِ الٰہی کو لے کر آئے تھے اس کے پیش نظر ہمیشہ دو مقاصد رہے ایک قلبی وروحانی اصلاح اور دوسرا معاشرتی وتمدنی کامیابی۔ اس لحاظ سے اس میں دو طرح کے قوانین پائے جاتے ہیں۔

انسانی زندگی کے حالات موقع وضرورت کی مناسبت سے بدلتے رہتے ہیں۔ لہذا ضرورت کے مطابق ان اسلامی قوانین میں تبدیلی کی گنجائش ہے۔ اسلام کے

بنیادی اصول محدود اور ہمیشہ رہنے والے ہیں لہذا نئے حالات اور ضرورت کے مطابق ان اصولوں کی روشنی میں مسائل کو حل کرنے کی ضرورت پڑتی ہے، جس کی وجہ سے فقہ کی تدوین عمل میں آئی۔

عہد رسالت میں آپ ﷺ کی ذات مبارک تمام مسائل کا حل پیش کر دیتی تھی لیکن جب غیر عرب اقوام میں اسلام پھیلا تو مسلمانوں کو نئے تہذیب وتمدن سے واسطہ پڑا جس کی وجہ سے نئے نئے مسائل سامنے آئے جن کو صحابہ کرامؓ نے قرآن و حدیث کی روشنی میں حل کیا۔ عہد صحابہؓ کے بعد تابعین نے لوگوں کی سہولت کے پیش نظر ان قوانین کو مرتب کرنے کی ضرورت محسوس کی لہذا علماء نے نئے پیش آنے والے مسائل پر غور وفکر کیا جس کے نتیجے میں علماء کی مختلف رائے سامنے آئیں۔ علماء نے ان رایوں کو ایک جگہ جمع کر دیا اور ساتھ ہی ان کے ماخذ کی تشریح بھی کر دی تا کہ دوسرے مسائل کا حل ان ہی اصولوں کی بنیاد پر تلاش کیا جائے یہ اصول ہمارے لیے قانون کی حیثیت رکھتے ہیں جو علم فقہ یا شرعی قوانین کے نام سے جانے جاتے ہیں۔

فقہ کا ارتقاء

فقہ اسلامی کی تدوین اور اس کے ارتقاء کو ہم چار ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

ا۔ فقہ عہد نبوی ﷺ دس ہجری تک

اس دور میں فقہ سے متعلق تمام امور حضور اکرم ﷺ کی ذات مبارک سے وابستہ تھے۔ قانون سازی، فتاویٰ اور فیصلے وغیرہ آپ ﷺ خود انجام دیتے تھے۔ اس دور میں فقہ کی باقاعدہ تدوین نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی ضروریات زندگی محدود ہونے کی وجہ سے اس کی ضرورت تھی۔ اس دور میں فقہ کے دو ماخذ تھے۔

ا۔ کتاب اللہ   ۲۔ حدیث نبوی ﷺ

ان دونوں کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ نے ایک طرف قانون کو مدون کرنے اور اس سے مسائل کا حل تلاش کرنے کا پورا خاکہ تیار فرما دیا تھا اور دوسری طرف قانون کو نافذ کر کے عملی طور پر ایک معاشرہ کی تشکیل فرما دی تھی جو قانون کے اتار چڑھاؤ اور نوک پلک سے بخوبی واقف تھا۔

۲۔فقہ عہد خلفاء راشدین اکتالیس ہجری تک

اس دور میں پہلی جیسی سادہ اجتماعی زندگی باقی نہ رہی تھی بلکہ فتوحات کی وجہ سے غیر عرب قوموں کے اسلام میں داخل ہونے سے نئے نئے سیاسی، سماجی اور اجتماعی مسائل سامنے آنے لگے۔ ان مسائل کے حل تلاش کرنے کے لیے فقہ اسلامی میں وسعت پیدا کرنے کی ضرورت پیش آئی اور دو نئے ماخذ اجماع اور قیاس کا اضافہ ہوا۔ ان دونوں ماخذوں سے اصول وضوابط اور مسائل کا حل تلاش کرنے کی ترغیب خود قرآن وسنت میں موجود ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد صحابہ کرامؓ دین اسلام کے محافظ و مبلغ تھے اس لیے انھوں نے اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے فقہ کو وسیع کرنے کی راہیں کھول دیں اور اجماع کو منظم شکل دینے کے لیے باصلاحیت افراد پر مشتمل ایک مجلس قائم کر دی گئی جو نئے مسائل کا حل قرآن وسنت کی روشنی میں باہمی مشورہ سے طے کرتی تھی جو قانون کا درجہ حاصل کر کے قابل عمل ہوتا۔ مثلاً ایران کی مفتوحہ زمین کی تقسیم کے مسئلہ پر کئی دنوں تک مجلس کی بحث و مباحثہ کے بعد حضرت عمرؓ نے فیصلہ فرمایا کہ یہ زمین مجاہدین کے درمیان تقسیم نہیں کی جائے گی۔

رائے کے استعمال کے لیے اصول وقواعد تو بعد میں تیار کیے گئے لیکن رائے کا استعمال حدود شریعت اور اصول دین کے تحت ہی ہوتا تھا اور اگر آزادانہ رائے کسی اصول سے ٹکراتی تو نہ صرف اس کو دور کیا جاتا بلکہ اس کو سخت ناپسند کیا جاتا۔

ان دونوں ماخذوں کے اضافے کے باوجود بھی اس دور میں فقہ عملی اور واقعاتی رہا اس وجہ سے اس وقت پیش آنے والے مسائل کو ہی حل کیا جاتا تھا مستقبل کے مسائل پر قیاس آرائی نہیں کی جاتی تھی اس زمانہ میں صحابہؓ کے درمیان محدود اختلافات بھی سامنے آئے اس دور کے مشہور فقیہ خلفاء راشدین، عبداللہ ابن مسعودؓ ابوموسیٰ اشعریؓ، زید بن ثابتؓ، معاذ بن جبلؓ، ابی بن کعبؓ وغیرہ ہیں۔

اس عہد میں مسلمانوں کا سیاسی اعتبار سے تین فرقوں میں تقسیم ہوجانے کا اثر فقہ پر پڑا۔

ا۔شیعان علیؓ ۲۔حامیان امیر معاویہؓ ۳۔خوارج

اختلافات اگرچہ سیاسی تھے لیکن روایت اور رائے پر اس کا اثر پڑنا لازمی تھا جس کی بناء پر فتاویٰ میں بھی اختلاف ہوتا تھا۔

۳۔فقہ اکتالیس ہجری سے دوسری صدی ہجری تک

فقہ اسلامی کا تیسرا دور حضرت امیر معاویہؓ سے شروع ہوکر دوسری صدی ہجری تک رہا یہ فقہ کی تدوین کا تاسیسی دور ہے۔ فقہ کی ترتیب وتدوین کا پورا مواد اسی دور میں تیار ہوا تھا۔ اس دور کی درج ذیل خصوصیات فقہ اسلامی پر بھی اثر انداز ہوئیں بلکہ فقہ اسلامی کی وسعت اور ارتقاء میں ان کا اہم کردار رہا ہے۔

ا۔ مسلمانوں کی باہمی فرقہ بندیاں اور ان کے سیاسی انتشار کی وجہ سے ہر فرقہ اپنے لوگوں کو ترجیح دیتا۔

۲۔اسلامی مرکز میں پہلی جیسی جاذبیت وکشش کے باقی نہ رہنے کی وجہ سے نیز اسلام کے مقاصد کو آگے بڑھانے کی غرض سے علماء وفقہاء مختلف شہروں میں پھیل گئے اور اپنے مدارس قائم کرکے تعلیم وتربیت کے ذریعہ تابعین کی ایک جماعت تیار کردی جو ان کے صحیح جانشیں ثابت ہوئے اور فقہ کی تدوین کی۔

۳۔ احادیث کی روایات کا سلسلہ باقاعدہ شروع ہوا جس میں صحابہ احتیاط برتتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات اور خلفاء راشدین کے بعد جو صحابہ باقی رہ گئے تھے انھوں نے نظام شریعت کو درست کرنے کے لیے حضور اکرم ﷺ کی تعلیمات کو عام کیا اور اپنے تجربات سے لوگوں کو فیض یاب کیا۔

۴۔ غیر عربوں نے اسلامی تعلیمات حاصل کر کے تمام اسلامی شہروں میں تعلیم و تربیت کے مراکز قائم کیے یہ حضرات موالی کے نام سے پکارے جاتے تھے اور صلاحیت میں عربوں سے کم نہ تھے۔ جنھوں نے نظام شریعت پر نئے انداز سے غور و فکر کرنے کے مواقع فراہم کیے۔

۵۔ رائے اور حدیث کو استعمال کرنے کی حد میں اختلاف کی وجہ سے دو گروہ بن گئے محدثین ان ہی حدیثوں کو سامنے رکھ کر فتویٰ دیتے جو موجود تھیں۔ چنانچہ ان کا دائرہ تنگ اور محدود تھا جب کہ فقہاء شریعت کو عقلی اور اصولی معیار سے دیکھتے تھے اور حدیث نہ ملنے کی صورت میں رائے کا استعمال کرتے تھے اس بناء پر ان کا دائرہ وسیع تھا۔ اہل حجاز کا رجحان اول کی طرف اور مرکز مدینہ تھا ان کو حدیث حاصل کرنے میں آسانی تھی اور اہل عراق کا رجحان دوسرے کی طرف تھا جن کا مرکز کوفہ تھا ان کو حدیثیں حاصل کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

نئے نئے مسائل کے سامنے آنے کی وجہ سے قیاس، استحسان اور استصلاح وغیرہ کا کثرت سے استعمال ہونے لگا۔ محدثین نے ان کے خلاف سخت آواز اٹھائی لیکن سماجی اور عملی زندگی کی نت نئی مصلحتوں اور ضرورتوں نے ان کے اختلافات کی شدت کو کم کردیا اور ان کے شاگردوں کے درمیان باہمی استفادہ کا سلسلہ قائم ہوگیا۔ مختلف شہروں میں سرکاری طور پر قاضی مقرر کیے گئے جو قرآن و سنت کے مطابق

فیصلہ کرتے اور اگر کوئی مسئلہ ان دونوں میں نہ ملتا تو فقہا سے رجوع کرتے اور ان کے فتاویٰ اور رائے کے مطابق فیصلہ کرتے۔

اس دور کے مشہور فقہاء میں چند درج ذیل ہیں:

ا۔ حضرت عائشہؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت ابوہریرہؓ، انس بن مالکؓ، سالمؒ، سلمانؒ، قاسم بن محمد بن ابوبکرؒ، ابن شہاب زہریؒ، ابوزبیرؒ، محمد بن مسلمہؒ، علقمہ، ابراہیمؒ، ابوادریسؒ وغیرہ۔

مذکورہ تمام افراد کے فقہ و روایت میں مشہور ہونے کے باوجود فقہ کے مختلف اسکول اس دور میں قائم نہ تھے بلکہ مختلف شہروں کے لوگ فتویٰ لینے آتے اور جس سے چاہتے فتویٰ لیتے۔

۴۔ فقہ دوسری صدی ہجری سے چوتھی صدی ہجری تک

اس دور میں فقہ کی باقاعدہ تدوین ہوئی۔ جلیل القدر امام اور پیشواء جن کے ماننے والے ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اسی دور کے ہیں۔

اس دور میں درج ذیل خصوصیات فقہ پر اثر انداز ہوئیں۔

ا۔ اسلام کی اشاعت کی وجہ سے تمدن کی وسعت ہوئی جس کی وجہ سے نئی نئی ضرورتیں پیدا ہوئیں اور غور و فکر کے نئے نئے میدان سامنے آئے۔

۲۔ یونانی علوم و فنون کی ترویج ہوئی اور ایک دوسرے سے استفادہ کے مواقع فراہم ہوئے۔

۳۔ تدوین حدیث کا کام اسی دور میں انجام پایا اور تقریباً تمام اسلامی شہروں میں اس پر توجہ دی گئی نماز، روزہ سے متعلق احادیث کو سلسلہ وار جمع کیا گیا نیز حدیث نبوی ﷺ کو صحابہ و تابعین سے الگ کر کے نقل کیا گیا یہ کتابیں مسانید کہلائیں۔

۴۔ حدیث کی حجیت اور اس سے فقہ کے استنباط کے ضابطے وطریقے مقرر کیے گئے نیز فقہ کے چاروں مذاہب (حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی) اسی دور میں وجود میں آئے۔

۵۔ قیاس واستحسان کو ماخذ قرار دینے میں اختلاف ہوا محدثین نے قیاس کے زیادہ استعمال پر پابندی لگانے کی کوشش کی۔

۶۔ اجماع کی شرطوں میں اختلاف ہوا جس کی بناء پر مسائل ثابت کرنے میں مختلف زاویۂ نگاہ پیدا ہوئے۔

۷۔ اسلامی احکامات کے ثبوت کے درجہ وطریقہ میں اختلاف ہونے نیز قرآن وسنت کے اسلوب بیان اور ضرورتوں کے پیش نظر فرض، واجب، سنت، مستحب وغیرہ اصطلاحیں مقرر کی گئیں۔

۸۔ فقہاء نے اصول فقہ پر بہت ساری کتابیں لکھیں اور نہایت کامیاب طریقے پر اس فن کو مدون کیا جس سے بعد کے لوگوں کو رہنمائی حاصل ہوئی۔

یہ دور چونکہ خیالات میں وسعت اور مختلف ماحول وتمدن کے ملنے کا تھا اس بناء پر لازمی طور سے فقہ اسلامی عملی اور واقعاتی نہ رہا، بلکہ ایک حد تک نظری اور خیالی بن گیا۔ واقعات ومسائل کے پیش آنے سے پہلے انہیں قیاس کر کے ان کے متعلق احکام بیان کیے گئے جس میں عراق کے فقہاء بازی لے گئے اس میں شک نہیں کہ اس طریقۂ کار سے فقہ نہایت وسیع وضخیم بن گیا لیکن اس سے بھی انکار نہیں کہ اس کی وجہ سے لوگوں میں سہل پسندی اور عافیت کوشی پیدا ہوگئی۔

اس دور کے مشہور فقہاء میں امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام جعفر صادقؒ، امام ابو یوسفؒ وغیرہ ہیں۔

فقہ اسلامی کے مآخذ

تعریف: ماخذ ان بنیادی ذرائع کو کہتے ہیں جن سے قانون بنایا جاتا ہے یا وہ مقامات جہاں سے قوانین دلائل کے ساتھ اخذ کئے جاتے ہیں اور جس فن میں ان ذرائع اور مقامات سے بحث ہوتی ہے انھیں اصول فقہ کہتے ہیں۔

فقہ کے مندرجہ ذیل چار بنیادی ماخذ ہیں۔

ا۔قرآن کریم
۲۔سنت رسول ﷺ
۳۔اجماع
۴۔قیاس

ا۔قرآن کریم

اللہ تعالی نے انسانوں کی ہدایت کے لیے قرآن کریم نازل فرمایا جس میں اس نے تمام اصول وکلیات بیان کر دیے ہیں جو مختصر ہونے کے باوجود جامع اور مکمل ہے لہذا اسی کے ساتھ شریعت کی تکمیل کر دی گئی۔قرآن کریم اللہ تبارک و تعالی کا آخری ہدایت نامہ ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی تعلیمات ہر دور اور ہر زمانے کے لیے ہیں لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ تمام شعبۂ زندگی کے لیے ایک حد مقرر کر کے ان کی تفصیل زمانہ کی ضرورت اور تقاضوں پر چھوڑ دی جاتی، اگر شروع میں سارے جزئیات بیان کر کے اس کے عملی خاکے تیار کر دیے جاتے تو قرآن

کریم کی دستوری شکل باقی نہ رہتی اور ساری تعلیمات ایک مخصوص زمانے کے لیے ہوکر رہ جاتیں جس میں نئے زمانہ اور تقاضوں کے مطابق معاشرہ کے مسائل حل کرنے کی صلاحیت باقی نہ رہتی۔ چونکہ قرآن کریم کی تعلیمات قیامت تک کے لیے ہیں اسی لیے یہ اصول بیان کردیے گئے ہیں۔ فقہاء قرآن کریم کے اصول و کلیات کی روشنی میں ہر زمانہ اور ہر دور میں معاشرہ کی ضرورت کے پیش نظر مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں۔ اور انسانوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔

۲۔ سنت رسول اللہ ﷺ

سنت سے مراد طور طریقے کے ہیں لیکن فقہ کی اصطلاح میں سنت رسول اللہ کے اقوال وافعال اور تقریر کو کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں سنت کے مآخذ ہونے کی دلیل اصولی طور پر موجود ہے۔ اللہ تعالی فرماتا ہے کہ:

''کہد وا ے محمد اللہ تعالی کی اطاعت کرواور رسول کی اطاعت کرو'' (سورہ نساء، آیت-۶۳)

دوسری جگہ ارشاد باری تعالی ہے کہ'' کہد وا ے نبی اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہوتو میری پیروی کرو تو اللہ تم سے محبت کرے گا۔'' (سورہ آل عمران، آیت-۳۱)

حضور ﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا کہ ''میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جارہا ہوں اگر تم ان کو مضبوطی سے پکڑے رہو گے تو کبھی گمراہ نہ ہوگے ایک اللہ کی کتاب اور دوسرے میری سنت۔''

(موطا امام مالک، کتاب الجامع، حدیث-۱۳۹۵)

علامہ شاطبی فرماتے ہیں کہ ''سنت میں کوئی بیان ایسا نہیں ہے کہ جس کی اصل قرآن میں نہ ہو۔ پس سنت قرآنی احکام و معانی کے لیے شرح و تفسیر کی حیثیت رکھتی ہے۔ نبی کریم ﷺ کی پوری زندگی قرآن کریم کی عملی تفسیر تھی اور جب ایک صحابیؓ نے

حضرت عائشہؓ سے معلوم کیا کہ آپ ﷺ کی زندگی کیسی ہے تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ ''کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا۔'' رسول اللہ ﷺ کے بعد صحابہ کرامؓ سنتِ نبوی ﷺ پر عمل پیرا رہے، جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ سنت کی سند ملنے پر فرماتے کہ ''اللہ کا شکر ہے کہ جس نے ان لوگوں کو باقی رکھا جن کے پاس ہمارے نبی کی سنتیں محفوظ ہیں۔'' حضرت عمرؓ قرآن کو سمجھنے کے لیے سنت کی تشریح کو بنیاد بناتے اور فرماتے کہ ''اے لوگو! تمہارے لیے سنتیں مقرر کردی گئی ہیں، فرائض کا تعین ہو چکا ہے، اس طرح تم کو واضح راستے پر لگا دیا گیا ہے۔ اب اگر کسی وجہ سے ادھر ادھر دیکھو گے تو گمراہ ہو جاؤ گے۔''

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ ''اگر سنتیں نہ ہوتیں تو ہم میں سے کوئی قرآن کو نہ سمجھ سکتا۔'' امام شافعیؒ کا قول ہے کہ ''تمام مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس حضور اکرم ﷺ کی کوئی سنت موجود ہو تو اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ اس کو چھوڑ دے۔'' امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ ''ہر وہ چیز جو کتاب و سنت کے مطابق ہو قبول کرلو اور جو مخالف ہو چھوڑ دو۔'' امام احمد بن حنبل کا قول ہے کہ ''اگر کسی شخص نے حضور اکرم ﷺ کی حدیث کو رد کر دیا تو وہ ہلاکت کے گڑھے میں جا گرا۔''

دراصل قرآن کریم نقشہ تعمیر ہے اور سنت رسول اللہ ﷺ اس نقشہ کے مطابق تعمیر کی ہوئی عمارت ہے اور ظاہر ہے دونوں ایک دوسرے کے لیے ضروری ہیں۔

۳-اجماع

اجماع کے معنی اتحاد و اتفاق کے ہیں، لیکن فقہاء کی اصطلاح میں اجماع کسی معاملہ میں علماء کے اتفاق کو کہتے ہیں۔ دراصل قانون کو زمانہ کے مطابق ڈھالنے کے لیے اجماع ایک قسم کا اختیار ہے جو اللہ تعالیٰ نے فکری و عملی صلاحیت رکھنے والے علماء کو

دیا ہے۔قرآن وسنت اپنے آپ میں جامع ومکمل ہیں لیکن علماء نے عقائد وشریعت کے اصول اورضروریات ومصلحت کے مطابق قوانین تیار کرنے کوہی شریعت کی تکمیل قرار دیا ہے۔فقہاء نئے پیش آنے والے مسائل کا حل قرآن وسنت میں تلاش کرتے ہیں لیکن واضح حکم نہ ملنے کی صورت میں قرآن وسنت کے اصول وکلیات کی روشنی میں آپس میں مشورہ کرکے طے کرتے ہیں جس کی اجازت قرآن میں موجود ہے اسی کو اجماع کہتے ہیں۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ:

''اے ایمان والواللہ کی اطاعت کرو،اس کے رسول کی اطاعت کرواوران لوگوں کی اطاعت کروجوتم میں اولی الامر (سمجھدار) ہیں۔''
(سورۃ النساء، آیت ۶۳)

اولی الامر سے مراد ایسے علماء ہیں جو قرآن کی حکمتوں کو سمجھتے ہوں، سنت نبوی ﷺ سے بخوبی واقف ہوں نیز انھیں صحابہ کرامؓ کی زندگی اوران کے فیصلوں کا علم ہو۔قوم کے مزاج وحالات کے تقاضوں کے بارے میں سنجیدہ، اور عملی طور پر بلند اخلاق وکردار کے مالک ہوں۔

۴۔قیاس

قیاس کے معنی اندازہ کرنے کے ہیں فقہ کی اصطلاح میں وجہ کو بنیاد بنا کر سابقہ فیصلوں اور مثالوں کی روشنی میں نئے مسائل حل کرنے کو قیاس کہتے ہیں۔

قرآن وحدیث اور صحابہ کرامؓ کی زندگی میں قیاس کے مآخذ ہونے کی دلیل موجود ہے اور قرآن کریم وحدیث کو دلیل بنا کر ہی قیاس کا استعمال کیا جاتا ہے اگرچہ اس کا درجہ چوتھا ہے مگر عملی طور پر فقہ کا بڑا حصہ قیاس ہی سے معلوم ہوتا ہے اور یہی ہر

زمانے میں فقہ اسلامی کو زندہ رکھتا ہے اور حالات و زمانہ کے مطابق بناتا ہے کیونکہ قرآن وسنت کے اصول وکلیات ایک طرف ظاہری مفہوم تک محدود ہیں دوسری طرف حالات و زمانہ کی نئی تبدیلیاں اور ضرورتیں نئے مسائل پیدا کرتی رہتی ہیں۔ لہذا کسی مسئلہ میں قرآن وسنت کے خاموش ہونے یا اجماع کے نہ ہونے کی صورت میں غور وفکر کی ضرورت پیش آتی ہے اس کو قیاس کہتے ہیں۔

جب حضور اکرم ﷺ حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کے لیے روانہ کررہے تھے تو معلوم کیا کہ ''جب کوئی مقدمہ تمہارے سامنے پیش آئے گا تو کیسے فیصلہ کروگے تو انھوں نے جواب دیا کہ جیسا قرآن کریم میں ہے پھر سوال کیا گیا کہ اگر کتاب اللہ میں نہ ہو تب؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ سنت نبوی ﷺ کے مطابق۔ سوال کیا گیا کہ سنت نبوی ﷺ میں بھی نہ ہو تو حضرت معاذ بن جبلؓ نے جواب دیا کہ اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ خوش ہو کر حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے رسول کے فرستادہ کو اس بات کی توفیق دی جو اس کے رسول کو پسند ہے۔''

☆☆☆

امام اعظم ابوحنیفہؒ

(۸۰ھ-۱۵۰ھ)

نام ونسب: نعمان بن ثابت بن زوطی کا نام نعمان کنیت ابوحنیفہ اور لقب امام اعظم ہے۔آپ فارسی نسل تھے امام صاحب ۸۰ھ میں کوفہ میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد محترم بچپن میں حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اُنہوں نے آپ کے خاندان کے لیے دعاء کی تھی۔

تعلیم وتربیت: ۲۰/سال کی عمر میں تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے امام ابوحنیفہ کے زمانے میں چار صحابیؓ موجود تھے۔ بصرہ میں حضرت انس بن مالکؓ، کوفہ میں حضرت عبد اللہ بن اوفیؓ، مدینہ میں حضرت سہیل بن سعد ساعدیؓ اور مکہ میں حضرت ابوطفیل عامر بن واثلہؓ۔امام صاحب ان میں سے حضرت انس بن مالکؓ کے علاوہ کسی سے ملاقات نہ کر سکے۔کوفہ شروع زمانے سے ہی علم کا مرکز رہا یہ شہر عہد فاروقی میں بسایا گیا تھا نظم تعلیم کے لیے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ وہاں بھیجے گئے۔ جو عہد عثمانیؓ کے آخری زمانے تک قرآن اور علم دین کی تعلیم دیتے رہے ان کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نوآباد شہر میں بعض محدثین کے بیان کے مطابق چار ہزار علماء اور محدثین پیدا ہوئے حضرت علیؓ جب کوفہ پہونچے تو پکار اٹھے خدا ابن مسعودؓ کا بھلا کرے کہ انھوں نے اس بستی کو علم سے بھر دیا۔امام صاحب نے شروع میں علم قرأت، حدیث، ادب، شعر اور علوم قرآنی

وغیرہ کا مطالعہ کیا۔ امام صاحب نے امام حمادؒ کی شاگردی اختیار کی اور ان کی وفات تک پورے اٹھارہ سال ان کی خدمت میں رہے۔ ایک مرتبہ خلیفہ منصور نے ان سے پوچھا آپ نے علم کس سے حاصل کیا؟ امام صاحب نے کہا "حماد بن سلیمان سے انھوں نے ابراہیم نخعی سے انھوں نے عمر بن خطابؓ نیز حضرت علی بن طالبؓ سے اور عبداللہ ابن مسعودؓ اور عبداللہ ابن عباسؓ سے۔"

امام صاحب نے صرف کوفہ ہی کے تمام اساتذہ سے استفادہ نہیں کیا بلکہ حج کے موقع پر حجاز پہونچ کر فقہ وحدیث کے دوسرے اکابر سے بھی استفادہ کیا آپ نے حرمین کے شیخ عطا بن رباح سے مدینہ میں سالم بن عبداللہ سے حدیث روایت کی ساتھ ہی امام باقر سے استفادہ کیا عباسی خلیفہ منصور کے آخری دور میں ۱۳۰ھ سے ۶/سال تک مکہ میں رہے، شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے امام صاحب کے شیوخ کی تعداد چار سو بتائی ہے آپ نے کوفہ، بصرہ، حجاز وعراق سبھی جگہوں کی روایت کو قبول کیا ہے۔

شاگرد: امام صاحب اہل علم اور طلبہ پر خاص طور سے اپنا مال خرچ کرتے رہتے تھے۔ تجارتی منافع کا ایک خاص حصہ اسی کام کے لیے تھا اپنے خاص شاگرد امام ابو یوسف کے گھر کا پورا خرچ انھوں نے اپنے ذمہ لے لیا تھا کیوں کہ امام ابو یوسف کے غریب والدین ان کی تعلیم چھڑا کر کسی دوسرے کام میں انھیں لگانا چاہتے تھے۔ آپ کے شاگردوں کی تعداد تقریباً آٹھ سو ہے فقہاء میں امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ، امام زفرؒ، امام حسن بن زیادؒ اور محدثین میں عبداللہ ابن مبارکؒ، لیث بن سعدؒ، امام مالکؒ اور صوفیا میں فضیل بن عیاضؒ اور داؤد بن ابراہیم طاقؒ جیسے علماء شامل ہیں۔ آپ نے اپنے چالیس شاگردوں کی ایک مجلس قائم کی تھی جس میں مسائل پر غور وفکر ہوتا اور نتیجہ کو تحریر کر لیا جاتا اگر کسی مسئلہ پر سب متفق نہ ہوتے تو سب کی

رائے الگ الگ لکھ دی جاتی اور باہمی مشورہ کو ترجیح دی جاتی۔ اس میں عبادات، معاملات، کاروبار اور سیاسیات ہر طرح کے مسائل سے بحث کی جاتی۔

اخلاق و کردار: امام ابو حنیفہؒ خوش رو اور خوش اخلاق، فیاض اور نہایت کریم النفس انسان تھے۔ امام ابو حنیفہؒ کی گفتگو شیریں اور دل آویز تھی ایسی باتوں سے اجتناب کرتے جن سے فرقہ بندی کا ڈر ہوتا۔ عبداللہ ابن مبارک کہتے ہیں کہ میں نے امام ابو حنیفہؒ سے بڑھ کر کسی کو پرہیز گار نہیں دیکھا۔ امام ابو یوسف امام صاحب کے متعلق فرماتے ہیں۔ بخدا وہ اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے سخت پرہیز کرنے والے، اور اکثر خاموش رہنے والے آدمی تھے ہمیشہ غور و فکر میں لگے رہتے اور فضول باتیں کبھی نہیں کرتے تھے۔

وفات: اہل سنت والجماعت نے واقعہ کربلا کے بعد عباسی حکومت کے خلاف مدینہ میں نفس ذکیہ اور ان کے بھائی ابراہیم بن عبداللہ نے کوفہ میں علمِ بغاوت بلند کیا۔ امام صاحب نے ان کی تائید کی منصور نے ان کو قاضی کا عہدہ پیش کیا جس سے امام صاحب نے انکار کر دیا اس لیے ایک سو سینتالیس ہجری (۱۴۷ھ) میں قید کرا دیے گئے اور ایک سو پچاس ہجری (۱۵۰ھ) میں ان کو زہر دلوا دیا جس سے ان کا انتقال ہو گیا۔ امام ابو حنیفہؒ ان نادر روزگار ہستیوں میں سے تھے جنھوں نے غور و فکر کی شمع روشن کی اور وقت و اقتدار کی طاقت سے کبھی بھی مرعوب نہ ہوئے مصیبت اور آزمائش کے نازک ترین موقع پر بھی وہ ہمیشہ ثابت قدم رہے۔

علم حدیث میں خدمات

علم حدیث میں امام صاحب کو ایک خاص مقام حاصل ہے، یہی وجہ ہے کہ محدثین کرام امام صاحب کی عظمت کے قائل تھے یحییٰ بن معینؒ سے امام ابو حنیفہؒ کے

بارے میں پوچھا گیا کہ کیا وہ حدیث کے بارے میں سچے سمجھے جاتے تھے؟ انھوں نے کہا وہ نہایت سچے اور صحیح روایت کرنے والے تھے۔ امام ثوریؒ، ابن مبارکؒ، حماد بن زیدؒ، وکیع بن عبادؒ، جعفر بن عونؒ جیسے جلیل القدر محدثین نے امام صاحب سے روایت کی ہے امام داؤدؒ کا ارشاد ہے کہ خدا امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام ابو حنیفہؒ پر رحمت نازل کرے وہ اپنے زمانے کے امام تھے۔ خطیب نے یحییٰ بن معینؒ سے روایت کی ہے کہ ابوحنیفہؒ کے نزدیک حدیث کی روایت کرنے کی یہ شرط تھی کہ وہ سننے کے بعد سے برابر یاد رہے اگر یاد نہ رہے تو پھر اس کی روایت کرنا ان کے نزدیک درست نہ تھا۔ امام ابو یوسف کا بیان ہے کہ حدیث کی صحیح مراد اور اس سے مسائل کے استنباط کرنے میں امام صاحب سے بڑھ کر جاننے والا میں نے کسی کو نہیں دیکھا، امام صاحب کو تمام علوم میں دست گاہ حاصل تھی تفسیر، حدیث اور فقہ ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ علم حدیث میں امام صاحب کے اساتذہ کی تعداد جن سے انھوں نے روایات لی ہیں چار ہزار ہے جن میں دو ہزار امام حمادؒ کی حدیثیں ہیں اور باقی دو ہزار دوسرے مشائخ کی ہیں۔

امام صاحب نے حدیثوں کی روایات بہت کم کی ہیں اس کی وجہ یہ تھی کہ حدیثیں زیادہ یاد ہونے کے باوجود مسائل کے استنباط میں مشغول رہے۔ اسی طرح امام مالکؒ اور شافعیؒ کے مقابلہ میں روایات کم منقول ہیں جیسا کہ صحابہؓ میں حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ سے دیگر صحابہ کی بہ نسبت کم منقول ہیں حالانکہ ان کی معلومات کی کثرت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ امام موصوف نے محدثین کی طرح باضابطہ روایت حدیث کے حلقے قائم نہیں کیے حالانکہ ان کا شمار حفاظ حدیث میں کیا گیا ہے دار قطنیؒ، ابن شاہینؒ اور ابن عقدہؒ جیسے علماء حدیث نے ان کی مسانید جمع کیں ہیں۔ حدیث سے بے نیاز ہو کر انھوں نے اپنے فقہ کو ہرگز مرتب نہیں کیا ہے۔ محدث اسرائیل تعجب کے ساتھ کہتے ہیں ''نعمان کیا خوب شخص ہیں کہ انہیں وہ احادیث جو فقہی مسائل سے متعلق ہیں کیسی

یاد ہیں اور کس خوبصورتی سے وہ ان سے مسائل اخذ کرتے ہیں۔ یحییٰ بن سعید قطانؒ اور وکیعؒ جیسے محدث امام ابوحنیفہؒ کی فقہ کے مطابق فتویٰ دیتے اور امام صاحب کی روایت کردہ تمام احادیث یاد کرتے تھے انھوں نے امام صاحب سے بہت ساری حدیثیں سنی تھیں۔

امام ابوحنیفہؒ کے سب سے بڑے شاگرد امام ابویوسف نے کتاب الآثار میں امام ابوحنیفہ کی روایت کردہ ایک ہزار احادیث جمع کی ہیں۔ امام صاحب کے دوسرے شاگرد امام محمد، امام حسن بن زیاد اللؤلؤی اور امام صاحبؒ کے صاحبزادے حماد بن ابی حنیفہؒ نے بھی ان کی روایت کردہ حدیثوں کے مجموعے مرتب کئے تھے۔ اس کے علاوہ صدیوں تک بکثرت علماء امام صاحب کی مرویات ''مسند ابوحنیفہؒ'' کے نام سے جمع کرتے رہے۔ ان میں ۱۵/مسانید کا ایک جامع نسخہ قاضی القضاۃ محمد بن محمود الخوازی نے ''جامع مسانید الامام الاعظم'' کے نام سے مرتب کیا۔ یہ نسخہ شائع ہوگیا ہے۔ امام اعظم نے خود بھی چالیس ہزار احادیث سے منتخب کر کے صحیح احادیث پر مشتمل ایک کتاب مدون کی جس کا نام کتاب الآثار رکھا تھا۔

علم فقہ میں آپ کی خدمات

اپنے استاذ امام حمادؒ کی وفات کے بعد امام ابوحنیفہؒ ان کے جانشیں ہوئے اور تیس سال تک درس و تدریس اور افتاء کا کام انجام دیتے رہے اس مدت میں انھوں نے ساٹھ ہزار اور بعض لوگوں کے بقول تراسی ہزار قانونی مسائل کے جواب دیے جو الگ الگ عنوان کے تحت مرتب کئے گئے ہیں۔ امام صاحب نے تقریباً ۱۲/لاکھ ستر ہزار سے زائد مسائل مدون کئے۔

امام صاحب نے مختلف ابواب کے مسائل کو بھی مرتب کرنا چاہا انھوں نے اس

کام کا آغاز نماز سے کیا اور بہت سے احکام جمع کر کے اس کا نام کتاب العروس رکھا اسی دوران خواب میں دیکھا کہ وہ پیغمبر محمد ﷺ کی قبر مبارک کھود کر اندر کی ہڈیاں چاروں طرف پھینک رہے ہیں جس کی تعبیر بتائی گئی ہے کہ ایسا خواب دیکھنے والا پیغمبر اسلام کے علوم کی سارے عالم میں اشاعت کرے گا امام صاحب بہت خوش ہوئے اور تدوین فقہ کا کام جاری رکھا۔ ان کے شاگردوں کی تعداد تقریباً آٹھ سو ہے جو مختلف علاقوں میں درس و فتاویٰ دینے کے کام کو انجام دیتے تھے امام صاحب کے پچاس شاگرد عباسی حکومت میں قاضی کے عہدے پر بھی فائز تھے۔ امام صاحب نے ان تمام ہی مسائل سے بحث کی ہے جو خلافت راشدہ کے بعد کے حالات میں پیش آئے امام صاحب کی مجلس میں زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق بحث ہوتی تھی شاگرد اپنی پوری آزادئ رائے کے ساتھ اظہار کرتے۔ امام ابو حنیفہؒ پہلے شخص ہیں جنھوں نے کتاب الفرائض و کتاب الشروط ایجاد کئے اور ملکوں کے درمیان قانون کو مستقل حیثیت دی۔ اور جنگ و امن کے متعلق احکام بیان کئے۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ جو شخص فقہ میں کمال حاصل کرنا چاہے وہ امام ابو حنیفہ کی مدد کے بغیر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ دینی مسائل کے بارے میں امام صاحب کا اصول یہ تھا کہ وہ سب سے پہلے قرآن کو لیتے تھے اگر اس میں مسئلہ نہ ملتا تو اسے سنت رسول اللہ ﷺ میں تلاش کرتے اگر دونوں میں نہ ملتا تو صحابہؓ کے اقوال کو دیکھتے ان کے فیصلوں پر عمل کرتے، اگر صحابہؓ کے اقوال میں بھی مسئلہ نہ ملتا تو بعد والوں کی پیروی کرنا اپنے لیے ضروری نہ سمجھتے بلکہ دوسرے لوگوں کی طرح خود اجتہاد سے کام لیتے۔ امام صاحبؒ کا اصول یہ تھا کہ خبر واحد کو اس باب کی دوسری احادیث کے ساتھ ملا کر دیکھتے اور قرآن سے بھی ملاتے اگر اس کا مضمون ان کے مطابق ہوتا تو اس پر عمل کرتے ورنہ چھوڑ دیتے ابن حزم کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ کا مذہب یہ تھا کہ اگر ضعیف حدیث بھی مل جائے تو اس کے مقابلہ میں قیاس اور رائے کو چھوڑ دیا جائے۔ امام

صاحبؒ کے فقہ کی بنیاد قرآن وحدیث دونوں پر ہی رکھی گئی ہے امام صاحبؒ نے فقہ کو باقاعدہ مدون کرایا اور اس کو ان کے شاگردوں خاص کر قاضی ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نے جمع کیا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ مذہب حنفی کی بنیاد عبداللہ بن مسعودؓ کے فتاویٰ، حضرت علیؓ کے فیصلوں وفتاویٰ قاضی شریح اور کوفہ کے قاضیوں کے فتاویٰ پر ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے ان حضرات کے طریقہ کو سامنے رکھ کر مسائل کو دریافت کیا ہے اس کے علاوہ امام ابراہیم نخعی کے مذہب پر مسائل کے حل کی تلاش میں امام صاحب کو بڑی قدرت تھی۔

آج دنیا میں تقریباً تین چوتھائی مسلمان فقہ حنفی پر عمل کرتے ہیں۔ یہ زندگی کے تمام مسائل کا احاطہ بھی کرتی ہے اور باقی تینوں مسلکوں کے مقابلہ میں زیادہ آسان اور جلد سمجھ میں آنے والی بھی ہے۔ معاملات کے حصہ میں وسعت، استحکام اور باقاعدگی بہ مقابلہ دوسرے فقہوں کے زیادہ ہے غیر مسلموں (ذمیوں) کے حقوق آزادی سے بخشتے ہیں کیونکہ حضور اکرم ﷺ ان کے بارے میں تاکید فرماتے تھے۔ امام صاحب کا فقہ قرآن کریم کی اس آیت کی ترجمانی کرتا ہے کہ ''اللہ تم لوگوں کے ساتھ دین میں آسانی چاہتا ہے سختی نہیں۔''

☆☆☆

امام مالکؒ

(۹۵ھ-۱۷۹ھ)

نام ونسب: مالک بن انس بن مالک بن ابی عامر بن عمر بن الحارث بن غیمان کا نام مالک کینت ابوعبداللہ اور لقب امام دارالہجرہ ہے والد محترم کا نام انس تھا۔ آپ کا خاندان خالص عرب تھا جو دور جاہلیت اور اسلام دونوں میں معزز تھا آپ کے بزرگوں کا وطن یمن تھا سب سے پہلے آپ کے پردادا ابوعامر نے عہد نبوی ﷺ میں اسلام قبول کر کے مدینہ میں سکونت اختیار کی ان کے مورث اعلیٰ حارث یمن کے شاہی خاندان یعنی حمیر کی شاخ اصبح کے شیخ تھے اس لیے ذوالاصبح کے لقب سے مشہور ہیں آپ کی پیدائش ۹۵ھ میں ہوئی۔

حصول تعلیم: امام مالکؒ کو علم حدیث کا بے حد شوق تھا مگر مالی وسعت نہ تھی کہ باقاعدہ تعلیم حاصل کر سکیں تعلیم حاصل کرنے کے لیے امام صاحب نے گھر کی کڑیاں تک بیچ دیں امام مالکؒ کا حافظہ بے حد قوی تھا جو چیز ایک بار یاد کر لیتے اسے کبھی بھولتے نہیں تھے۔ امام مالکؒ کے زمانے میں مدینہ علم وفضل کا مرکز تھا لہٰذا آپ نے یہاں کے علماء سے بھرپور استفادہ کیا۔

اساتذہ: امام صاحب نے امام نافعؒ اور امام زہریؒ جیسے اہل علم سے استفادہ کیا

کیا یحیٰ بن سعیدؒ، محمد بن منکدرؒ، ہشام بن عروہؒ، زید بن اسلمؒ اور ربیعہ بن عبدالرحمٰنؒ سے بھی علم حدیث حاصل کیا۔ جن اہل علم سے امام صاحب نے استفادہ کیا ان کی تعداد نو سو تک پہونچتی ہے ان میں تین سو تابعین اور چھ سو تبع تابعین ہیں۔ لیث بن سعد، ابن مبارک، امام شافعی اور امام محمد بن حسن الشیبانی جیسے اکابر اہل دین امام صاحب کے تلامذہ میں شامل ہیں جن شیوخ سے موٴطا میں روایت کی ہے ان کی تعداد ۹۵ ہے اور یہ سب مدنی ہیں۔ اس طرح مدینہ کا سارا بکھرا ہوا علم ایک سینے میں جمع ہو گیا آپ کے شیوخ میں چھ غیر مدنی ہیں آپ نے قرآن کی قرأت مدینہ کے امام القراء نافع بن عبدالرحمٰنؒ سے حاصل کی حضرت نافع حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے غلام تھے۔ محدثین امام مالک عن نافع عن ابن عمر کو سلسلۃ الذہب (سونے کی زنجیر) قرار دیتے ہیں اس کے علاوہ شام، بصرہ، خراسان وغیرہ کے علماء سے بھی آپ نے حج کے موقع پر استفادہ کیا۔ ابو عثمان ربیعہ سے فقہ کی تعلیم حاصل کی۔

شاگرد: امام صاحب سے روایت کرنے والوں کی تعداد ۱۳۰۰ سو سے زائد بتائی جاتی ہے ان میں بہت سے امام وقت اور مشہور علماء کرام شامل ہیں جیسے امام شافعیؒ، محمد بن ابراہیمؒ، ابن دینارؒ، ابو ہاشمؒ، اور عبدالعزیز بن ابی حازمؒ وغیرہ ان کے علاوہ امام صاحبؒ کے شاگردوں میں معن بن عیسیٰؒ، یحیٰ، عبداللہ بن مسلمہ قعبنی اور عبداللہ بن وہبؒ کے علمی مقام کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ یہ بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، امام احمد بن حنبل، جیسے محدثین کے استاد ہیں۔

اس کے علاوہ امام محمدؒ، امام شافعیؒ اور امام ابو یوسفؒ آپ کے شاگردوں میں شامل ہیں آپ نے تقریباً ۶۲ سال مسلسل فقہ و فتاویٰ اور درس و تدریس میں گذارے، امام زہری، شیخ ابوالأسود، ربیعہ الرائی، یحیٰ بن سعد انصاری وغیرہ ان

کے شیوخ ہیں لیکن انھوں نے بھی امام صاحب سے روایت کی ہے۔

فقہ مالکی: امام مالک فقہ کے چار مشہور مذاہب میں سے ایک مذہب کے امام ہیں۔آپ کی فقہ، فقہ مالکی کے نام سے مشہور ہے۔اہل مدینہ میں سے فقہاء صحابہؓ جیسے حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عائشہؓ، کبائر تابعین میں فقہاء سبعہ اور امام زہری وغیرہ کی روایات پر فقہ مالکی کی بنیاد ہے۔ (فقہاء سبعہ سے مراد سعید بن المسیب، عبیداللہ بن عتبہ بن مسعود، عروہ، قاسم بن محمد بن ابی بکر، ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث، سلیمان بن یسار، خارجہ بن زید ہیں۔) یہ مدینہ کے حدیث کے عالم تھے اور ان کا متفقہ فیصلہ مدینہ کی عدالت کا فقہی حکم مانا جاتا تھا۔امام مالک کے فقہ وفتاویٰ کی بنیاد اسی پر ہے۔

امام مالکؒ فتاویٰ میں پہلے کتاب اللہ پر بھروسہ کرتے تھے، پھر رسول اللہ ﷺ کی احادیث پر اعتماد کرتے تھے، جو ان کے نزدیک صحیح تھی اس سلسلہ میں ان کا دارومدار علماء حجاز کے اکابر محدثین پر تھا۔اہل مدینہ کے عمل کو اور خاص طور سے ائمہ کے عمل کو امام مالکؒ زیادہ اہمیت دیتے تھے۔امام صاحب کو مدینہ سے اس قدر محبت تھی کہ کبھی مدینہ سے باہر نہ نکلے۔سفر کے وقت باہر نکلتے تھے وہ بھی بغیر سواری کے۔خلیفہ ہارون رشید نے امام مالکؒ سے کہا: میری خواہش ہے کہ موطا کو خانہ کعبہ پر لٹکا دوں اور لوگوں کو اسی پر عمل کرنے کے لیے ابھاروں۔امام صاحبؒ نے کہا کہ ایسا نہ کیجیے، خود رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کے درمیان فروع میں اختلاف رہا اور وہ ہر جگہ پھیل چکے ہیں اور ہر ایک مسلمان نے کسی ایک صحابی کی پیروی کر کے اپنے لیے نجات کی راہ بنالی ہے۔

وفات: ۱۳۵ھ میں محمد نفس ذکیہ نے مدینہ میں اور ان کے بھائی ابراہیم نے بصرہ میں بغاوت کی تو آپ نے ان کا ساتھ دیا، جس کی وجہ سے مدینہ کے گورنر جعفر بن سلیمان نے

آپ کو ستر کوڑے لگوا کر اونٹ پر بٹھا کر شہر میں گھموایا۔ آپ کے دونوں ہاتھ مونڈھے سے اتر گئے اور پیٹھ پر خون اتر آیا۔ جب منصور حج پر آیا تو اس نے جعفر سے قصاص لینا چاہا لیکن امام مالکؒ نے منصور کو ایسا کرنے سے روک دیا اور فرمایا کہ ''جب کوئی کوڑا پڑتا تو جعفر کو قرابت رسول اللہ ﷺ کے سبب معاف کر دیتا۔''

امام صاحب تین ہفتہ بیمار رہے ۱۱؍ ربیع الاول ۱۷۹ھ میں چھیاسی سال کی عمر میں آپ نے وفات پائی اور جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔

مؤطا امام مالک: مؤطا کے معنی روندا ہوا یا تیار کیا ہوا، نرم اور سہل بنایا ہوا، کے ہیں۔ مدینہ کے تمام ہی علماء مؤطاء امام مالکؒ پر متفق ہیں اور اسی پر عمل کرتے ہیں۔ یہ نقش اول اور بنیادی کتاب ہے جب کہ بخاری نقش ثانی ہے اور اسی پر مسلم و ترمذی کی بنیاد ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مؤطا کی تالیف خلیفہ منصور کی فرمائش پر ہوئی۔ خلیفہ منصور نے امام مالکؒ سے کہا تھا کہ آپ لوگوں کے لیے ایک کتاب مرتب کریں جس سے وہ فائدہ اٹھائیں اس میں ابن عباسؓ کی نرمی اور ابن عمرؓ کی سختی سے پرہیز کریں اور لوگوں کے لیے اسے خوب روند کر نرم و آسان کر دیں امام مالک کہتے ہیں کہ ''بخدا انھوں نے تصنیف کا طریقہ سکھا دیا اسی لیے اس کتاب کا نام المؤطا رکھا'' یہ اہل مدینہ کے فتاویٰ اور روایات کا بہترین انتخاب ہے۔ اس میں صرف اہل مدینہ کی روایات بیان کی گئیں ہیں۔ صحت کا پورا خیال رکھا گیا ہے اسی لیے اس کو صحیح مانا جاتا ہے۔ آپ نے اہل حجاز کی قوی روایات کو تلاش کر کے اس کے ساتھ صحابہ و تابعین اور علماء کے فتاویٰ کو بھی جمع کیا ہے۔ آپ راویوں کے سلسلے میں تحقیق کرتے۔ جو شخص حدیث میں ان کے معیار پر کھرا نہ اترتا اس کی روایت قبول نہ کرتے۔ آپ نے مؤطا ۱۳۰ھ اور ۱۴۱ھ کے درمیان تالیف کی۔ آپ نے ایک

لاکھ احادیث روایات کیں ان میں سے دس ہزار داخل کیں تحقیق کے بعد ۱۷۲۵ (سترہ سو پچیس) باقی رہیں جن میں مرفوع چھ سو، مرسل دوسو اٹھائیس، موقوف چھ سو تیرہ، اور تابعین کے اقوال وفتاویٰ دوسو پچاسی ہیں اس کتاب میں راوی صحابہ کی مجموعی تعداد ۹۸ ہے۔

ضعف اور عمر درازی کے باوجود مدینہ میں آپ سواری پر نہیں چلتے تھے کہ اس سرزمین میں نبی ﷺ کا جسد مبارک مدفون ہے۔ حدیث روایت کرنے سے پہلے وضو کرتے، اچھا لباس پہنتے، خوشبو لگاتے اور بالوں میں کنگھا کرتے لوگوں نے سبب پوچھا تو کہا کہ میں آنحضرت ﷺ کی حدیث کی تعظیم وتوقیر کرتا ہوں۔

امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ جب حدیث کے کسی ٹکرے میں شبہ ہوتا تو پوری حدیث کو چھوڑ دیتے اور مزید کہتے کہ امام مالک نجوم کی طرح ہیں میں ان سے زیادہ کسی پر اعتماد نہیں کرتا ہوں جب ان کی کوئی حدیث سنو تو دونوں ہاتھوں سے مضبوط تھام لو۔'' امام سفیانؒ کہتے ہیں'' کہ رجال کی تحقیق (چھان بین) میں امام مالکؒ سے بڑھ کر کوئی آدمی نہیں'' امام وہب بن خالدؒ کہتے ہیں کہ'' مشرق ومغرب کے درمیان احادیث میں امام مالک سے بڑھ کر قابل اعتماد کوئی شخص نہیں۔''

ائمہ اربعہ میں امام مالک کو صرف یہ امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے حدیث کی کتاب'' مؤطا'' مرتب کی مؤطا حدیث کی پہلی کتاب ہے جو فقہی ترتیب کے ساتھ لکھی گئی۔ محدثین کی ایک جماعت کے نزدیک تو مؤطا کو بخاری ومسلم پر بھی فوقیت حاصل ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ مؤطا کو تمام کتابوں میں مقدم و افضل قرار دیتے ہیں انھوں نے لکھا ہے کہ محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ تمام روایات امام مالکؒ اور ان کے موافقین کی رائے میں صحیح ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے

ہیں کہ وہ تمام کتابیں جو سنن کے باب میں لکھی گئی ہیں جیسے سنن ابوداؤد، نسائی یا وہ کتابیں جن کا تعلق فقہ سے ہے جیسے صحیح بخاری و جامع ترمذی یہ سب موطا امام مالک ہی سے نکلی ہیں جو اس کے اردگرد گھومتی ہیں۔ موطا کو تقریباً ایک ہزار آدمیوں نے سنا اور حدیث میں ان سے سند حاصل کی۔ اس کتاب کو دنیائے اسلام میں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ اہل علم اس سے اب تک فیض یاب ہو رہے ہیں۔

خصوصیات

۱۔ موطا کی روایات کی اسناد تین چار واسطوں سے زیادہ نہیں ہیں۔ بخاری میں اگر ۲۲ ثلاثیات ہیں تو موطا کی بنیاد ہی ثلاثیات پر ہے۔ اس میں ۴۰ ثنائیات بھی ہیں یعنی حضور ﷺ اور امام مالک کے درمیان صرف دو ہی واسطے ہیں۔

۲۔ امام صاحب نے صحیح احادیث کو پہلی بنیاد اور آثار صحابہ وفتاویٰ کو دوسری بنیاد قرار دیا ہے اور صرف اسی فتویٰ کو قبول کیا ہے جس کی صحت پوری طرح ثابت تھی۔

۳۔ موطا میں حجاز کے محدثین وشیوخ کی روایات درج ہیں اور انہیں صحت و سند کے اعتبار سے دوسری تمام جگہ کی روایات پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس طرح اس مسئلے کو ترجیح دیتے ہیں جس پر اہل مدینہ کا اتفاق و عمل ہو۔

۴۔ موطا کی تصنیف کے وقت بہت سے اہم تبع تابعین موجود تھے اگر ان میں اختلاف ہوتا تو قوی قول کو ترجیح دیتے اور فرماتے جو میں نے سنا ہے اس میں یہ بہتر ہے۔ امام مالکؒ نے راوی کو روایت کا حافظ ہونا ضروری قرار دیا ہے۔

۵۔ امام مالک ایک باب کے تحت ان ہی مسائل کو بیان کرتے ہیں جو اس سے مناسبت رکھتے ہوں اور اپنا اجتہاد بھی نقل کرتے ہیں۔

۶۔ موطا میں حضرت علیؓ اور عبداللہ بن عباسؓ کی روایات بہت کم ہیں۔ ہارون

رشید نے اس کا سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ یہ دونوں میرے شہر میں نہ تھے اوران کے اصحاب سے میری ملاقات نہ ہوسکی۔

ایک موقع پر ہارون رشید نے امام مالک سے کہا! آپ کسی شخص کو مقرر کردیں کہ وہ میرے بچوں کو مؤطا پڑھادیا کرے۔ جواب میں انھوں نے کہا: یاامیر المؤمنین! خدا آپ کوعزت بخشے، یہ علم آپ ہی کے گھر سے نکلا۔ اگر آپ اسے عزت دیں گے تو معزز ہوگا اور اگر آپ ایسا نہیں کریں گے تو اس کا درجہ گر جائے گا۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ علم کے پاس جایا جاتا ہے۔ علم کسی کے پاس نہیں جاتا۔ ہارون نے کہا کہ: بے شک آپ سچ کہتے ہیں۔

مؤطا کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ علماء کی ایک بڑی جماعت نے اس کی شرحیں لکھیں، حواشی تیار کیے، مشکل الفاظ کی تشریح کی اور احادیث کی تخریج کی ہے نیز اس کے فقہی مباحث پر کتابیں لکھ کر اس کی مقبولیت کا احساس دلایا ہے۔ ابوعمر یوسف بن عبدالبر اندلسیؒ، امام سیوطیؒ اور محمد بن عبدالباقی زرقانیؒ نے اس کی شرح لکھی اور امام خطابیؒ، سیوطیؒ، ابن حزمؒ، ابوالولید سلیمان بن خلفؒ باجی نے تلخیص کی ہے۔ ہندوستان میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے فارسی میں المصفی اور عربی میں المسوی دو شرحیں لکھیں اس کے علاوہ مولانا زکریا نے بھی اوجز المسالک کے نام سے چھ ضخیم جلدوں میں شرح لکھی ہے۔

☆☆☆

امام شافعیؒ

(۱۵۰ھ-۲۰۴ھ)

نام ونسب: امام شافعیؒ کا نام محمد بن ادریس اور کنیت ابو عبد اللہ اور لقب ناصر السنہ ہے والد صاحب کا نام ادریس ہے آپ کا سلسلہ نسب حضور ﷺ کے جد اعلیٰ عبد مناف سے مل جاتا ہے آپ کی پیدائش غزہ میں ۱۵۰ھ میں ہوئی جس سال امام ابوحنیفہؒ کا انتقال ہوا۔ آپ کی والدہ کا تعلق یمن کے مشہور قبیلہ ازد سے تھا۔ دو سال کی عمر میں والدہ حجاز لے گئیں اور پھر واپس یمن آ گئیں۔ اور دس سال کے بعد آپ کی والدہ آپ کو مکہ مکرمہ لے آئیں اور یہیں آپ کی پرورش ہوئی۔ والد محترم کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا اس لیے آپ کی پرورش نہایت تنگدستی کے عالم میں ہوئی۔ مفلسی کے سبب کاغذ تک نہ تھا۔

تعلیم وتربیت: امام شافعیؒ نے سات سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ اور دس سال کی عمر میں مؤطا امام مالک کو یاد کر لیا تھا۔ امام صاحب نے ابتداء میں تاریخ، ادب، فقہ وغیرہ علوم کی تحصیل کی۔ فقہ کی تعلیم انھوں نے مسلم بن خالد سے حاصل کی جو اس وقت کے مفتی تھے اور پندرہ سال کی عمر میں اپنے شیخ کی اجازت سے فتویٰ دینے لگے۔ اس کے بعد امام مالکؒ کی خدمت میں رہ کر مؤطا امام مالک کا درس لیا۔ اور زبانی ہی قرأت کی جس کی وجہ سے امام مالک کو اس پر بہت تعجب ہوا اور فرمایا ''تم تقویٰ کو اپنا

شعار بنانا، ایک زمانہ آئے گا کہ خدا تم کو عظمت بخشے گا۔'' امام مالک کی خدمت میں عرصہ تک تحصیل علم میں مصروف رہے۔ انھوں نے آپ کو نصیحت کی کہ خدا نے تمہارے دل میں ایک نور ڈال دیا ہے اس نور کی حفاظت تم پر واجب ہے گناہ کر کے اس کو ضائع نہ کرنا۔''

اساتذہ و شاگرد: امام مالکؒ کے علاوہ امام محمدؒ، سفیان بن عیینہؒ، عبد العزیز دراوردیؒ، مسلم بن خالدؒ، امام شافعیؒ کے اساتذہ میں سے ہیں۔ آپ کے اساتذہ کی تعداد تقریباً ۸۰ بتائی جاتی ہے مدینہ، یمن، عراق اور مصر میں بہت سے اساتذہ سے آپ نے تعلیم حاصل کی۔

امام احمد بن حنبلؒ، ابو ثورؒ، ابراہیم بن خالدؒ، ابراہیم مزنیؒ، ربیع بن سلیم المرادیؒ، ابو الولید موسیٰ بن جارودؒ، اسحٰق بن راہویہؒ وغیرہ امام شافعیؒ کے مشہور شاگردوں میں شامل ہیں ان کے علاوہ لوگوں کی ایک کثیر تعداد ہے جن کو آپ سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔ امام احمد بن حنبلؒ کہا کرتے تھے کہ میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جس کا تعلق اسلام سے اس درجہ مضبوط ہو جتنا کہ اپنے زمانہ میں امام شافعیؒ کا تھا میں ہر نماز کے بعد دعا کرتا ہوں کہ خدایا میرے والد اور امام شافعی کے گناہوں کو معاف کر اور میری مغفرت فرما''۔

حالات زندگی: امام شافعی کو آزمائش کے دور سے گزرنا پڑا۔ تنگدستی اور غربت کے زمانہ میں قاضی یمن کی مدد سے نجران کے عامل بنا دیے گئے۔ آپ والی یمن کو اس کے ظلم و ستم سے روکتے اس لیے اس نے ہارون رشید کو شکایتی خط لکھا کہ شافعی علوی سادات کے ساتھ ہیں جس سے بڑا اندیشہ ہے۔ ۱۸۴ھ میں ہارون رشید کے حکم سے خلیفہ کے سامنے پیش ہونا پڑا۔ امام محمد وہاں موجود تھے ان کی سفارش سے رہا ہوئے۔ اس وقت امام شافعی کی عمر ۳۴ سال تھی۔ رہائی کے بعد وہ امام محمد کی شاگردی میں داخل ہوئے۔ اور تین سال سے زائد رہ کر علم فقہ (عراقی فقہ) کی تعلیم حاصل کی جس کو وہ اپنی

ساری زندگی کا سرمایہ قرار دیتے ہیں۔

وفات: امام شافعیؒ ۱۹۹ھ میں مکہ سے مصر تشریف لے گئے، وہیں ۲۰۴ھ میں انتقال ہوا۔ مصر میں ہی تدفین ہوئی۔

تصنیفات: آپ کی تصانیف کی تعداد تقریباً ۱۱۳ ہے جن میں الرسالہ، کتاب الام، سننِ شافعی، کتاب بغدادی، احکامِ القرآن، رسالہ قدیم و جدید، اختلاف الحدیث بہت مشہور ہیں۔

مسند شافعی: یہ امام شافعی کی تصنیف نہیں ہے بلکہ ان کی کتابوں سے احادیث کا انتخاب ہے جسے ابوجعفر محمد بن مطر نیشاپوری نے امام شافعی کے شاگرد ابوالعباس محمد بن یعقوب الاصم کے حکم سے منتخب کیا ان کو مؤلف اور ابوجعفر کو کاتب بتایا جاتا ہے۔

فقہ شافعی: ا۔ فقہ میں امام صاحب کا اصول یہ تھا کہ وہ صحیح احادیث کو لیتے اور ضعیف کو چھوڑ دیتے عبادات کے مسائل میں وہ احتیاط کا پہلو اختیار کرتے تھے۔

۲۔ امام شافعی مرسل حدیث کو دلیل نہیں سمجھتے تھے اس بارے میں انھوں نے اپنے سے پہلے علماء سے اختلاف کیا ہے۔ ایسی تمام روایات کو معمول بہا قرار دیا ہے اور جب کوئی روایت نہیں ملتی تو دوسرے دلائل کی طرف رجوع کرتے۔

۳۔ امام صاحب نے اصول فقہ پر ''الرسالہ'' تصنیف کیا اس لیے ان کو اصول فقہ کا بانی کہا جاتا ہے۔

۴۔ مسائل کے حل کے لیے پہلے قرآن اور پھر حدیث سے رجوع کرتے خواہ وہ کسی جگہ کے علماء سے حاصل کی گئی ہو۔

۵۔ حدیث کے معاملہ میں آپ امام مالک کی طرح اہل حجاز کی شرط نہیں رکھتے بشرطیکہ حدیث متواتر ہو۔ اس کے بعد اجماع پر عمل کرتے اور اگر اس سے بھی مسئلہ حل نہ ہوتا تو قیاس پر عمل کرتے لیکن اس کے لیے کسی اصول کا ہونا لازمی قرار دیتے۔

۶۔ بغداد میں انھوں نے علماء عراق کی کتابوں کے مطابق فتاویٰ دیے اور ان کے مسلک کے مطابق کتابیں لکھیں جوان کا قدیم مسلک کہلاتا ہے۔اس کے بعد مکہ اور مصر آ کر علماء مصر کے سامنے نیا مسلک پیش کیا جو پہلے سے مختلف تھا اور فقہ جدید کہلایا۔

۷۔امام شافعی نے فقہ حنفی اور مالکی دونوں سے استفادہ کیا اس لیے آپ کی فقہ میں دونوں کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

آج کل انڈونیشیا، ملیشیا، حجاز، مصر و شام اور مشرقی افریقہ کے زیادہ تر مسلمان فقہ شافعی پر عمل پیرا ہیں بلکہ فقہ حنفی کے بعد اسی فقہ کے ماننے والے سب سے زیادہ ہیں۔

حدیث میں خدمات

۱۔امام شافعی سے پہلے فقہ حنفی و مالکی مدون ہو چکا تھا۔ان میں احادیث مرفوعہ کے ساتھ صحابہ وتابعین کے اقوال بھی درج تھے۔علماء مسند و مرسل دونوں حدیثوں سے استدلال کرتے تھے۔لیکن امام شافعی نے احتیاط کی وجہ سے مرسل حدیث کے استدلال سے اختلاف کیا۔

۲۔اسی دور میں بعض ایسی روایات بھی سامنے آئیں جن پر صحابہؓ وتابعین کا تعامل نہ تھا۔اس لیے عام علماء نے ان کو قبول نہ کیا۔امام شافعی نے ان کو قبول کیا کیونکہ صحابہ وتابعین ہر مسئلہ میں حدیث تلاش کرتے جب کوئی روایت نہ ملتی تو دوسرے دلائل کی طرف رجوع کرتے۔

۳۔امام شافعی نے جمع روایات، تنقید احادیث، اصول روایت کے قاعدے بنائے۔

۴۔آپ نے کتاب الام اور رسالہ میں بکثرت روایات سے استدلال کیا ہے ابو زعفرانی کہتے ہیں کہ ''اصحاب حدیث خوابیدہ (سوئے ہوئے) تھے امام شافعی نے بیدار کیا اور امام محمد نے انہیں سند عطا کی۔''

امام احمد بن حنبلؒ

(۱۶۴ھ-۲۴۱ھ)

نام ونسب: ابوعبداللہ امام احمد بن محمد بن حنبل شیبانی مروی کا نام احمد اور کنیت ابوعبداللہ تھی۔ یہ خالص عربی النسل قبیلہ عدنان کی شاخ شیبان سے تعلق رکھتے تھے ان کی والدہ ان کی پیدائش سے پہلے مرو سے بغداد آگئیں۔ جہاں ربیع الاول ۱۶۴ھ میں ولادت ہوئی ابھی آپ تین سال کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔

ابتدائی تعلیم: امام احمد بن حنبل نے بچپن میں ہی قرآن مجید حفظ کرلیا تھا۔آپ نے بغداد میں ہی تعلیم حاصل کی، حدیث کی سماعت اور تحصیل حدیث کی غرض سے کوفہ، بصرہ، مدینہ، یمن، شام اور دوسرے مقامات کا سفر کیا اور ہر جگہ کے اہل علم اور علماء حدیث سے احادیث کی سند حاصل کی۔

اساتذہ: امام صاحب کے مشہور اساتذہ میں امام ابو یوسفؒ، ھشیم بن بشیرؒ، وکیعؒ، یزید بن ہارونؒ، یحییٰ بن سعید القطانؒ، سفیان بن عیینہؒ، امام شافعیؒ اور عبدالرزاق بن الہمامؒ جیسے اکابر شامل ہیں ان کے شیوخ کی تعداد ابن جوزی نے سو سے زیادہ بتائی ہے۔ امام احمد نے امام شافعی سے اجتہاد کے اصول سیکھے اور اس میں کمال حاصل کیا آپ کا حافظہ اچھا تھا صحیح اور ضعیف حدیث میں آسانی سے فرق کر لیتے تھے امام شافعیؒ

ان کے بہت قدر دان تھے۔ کہتے کہ بغداد چھوڑ کر جا رہا ہوں اس حالت میں کہ وہاں امام احمد سے بڑھ کر نہ کوئی متقی اور نہ کوئی فقیہ ہے۔

شاگرد: آپ نے چالیس سال کی عمر میں درس دینا شروع کیا جس میں سننے والوں کی تعداد پانچ ہزار تک ہوتی اور لکھنے والے تقریباً پانچ سو تک ہوتے مجلس سنجیدہ اور پروقار ہوتی۔ امام صاحب کے مخصوص شاگردوں میں امام بخاری، مسلم بن حجاج قشیری، ابوزراعہ اور ابوداؤد سجستانی ہیں۔ ان حضرات نے امام احمد بن حنبل سے حدیث کی روایت کی ہے امام صاحب سے روایت کرنے والوں میں ان کے بیٹے صالح، عبداللہ، چچازاد بھائی حنبل اور اسحاق بھی ہیں۔

اخلاق و کردار: امام احمد کو صبر و توکل اور تقویٰ میں بہت بلند مقام حاصل تھا اس شان و عظمت کے باوجود امام صاحبؒ نے کبھی عیش و عشرت کی تمنا نہیں کی اور نہ کبھی کسی سے کچھ قبول کیا۔ حسن بن عبدالعزیز نے ایک ہزار کی تین تھیلیاں امام صاحب کی خدمت میں پیش کیں اور عرض کیا، یہ مال مجھے جائز طریقے سے میراث میں ملا ہے۔ ان میں سے کچھ حصہ آپ قبول فرمائیں اور اپنے اہل و عیال کی ضروریات پر خرچ کریں۔ لیکن امام صاحبؒ نے ایک اشرفی کو بھی قبول نہیں کیا اور فرمایا: مجھے اس کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ امام صاحبؒ کے بیٹے عبدالرحمٰنؒ کہتے ہیں کہ میرے والد ہر نماز کے بعد کہا کرتے تھے: خدایا! جس طرح تو نے میرے چہرے کو دوسروں کے سامنے جھکنے سے بچایا ہے اسی طرح تو مجھے سوال کرنے سے محفوظ رکھ۔ سنت رسول اللہ سے بڑی محبت تھی لہذا اسے ہرگز نہ چھوڑتے خلفاء سے دور رہتے اور اگر کبھی ان کے تحائف قبول کر بھی لیتے تو غریبوں میں تقسیم کر دیتے۔ روزے کثرت سے رکھتے۔ ابوداؤد سجستانی کہتے ہیں کہ ان کی مجلس، مجلس آخرت ہوتی تھی جسمیں امور دین کے سوا اور کسی چیز کا ذکر

نہیں ہوتا۔ امام شافعی کہتے تھے کہ میں نے بغداد میں پرہیزگاری، تقویٰ علم میں احمد بن حنبل سے کسی کو زیادہ نہیں پایا احمد بن سعید دارمی کا بیان ہے کہ میں نے حضور اکرم ﷺ کی حدیثوں کو احمد بن حنبل سے زیادہ یاد رکھنے والا کسی کو نہیں دیکھا۔ اسحاق بن راہویہ کہتے تھے کہ احمد خدا اور بندوں کے درمیان حجت ہیں۔

وفات: امام صاحب نے ۷۷ سال کی عمر میں نو روزہ بیماری کے بعد ۱۲/ربیع الاول ۲۴۱ھ میں انتقال فرمایا۔ جنازے میں بے شمار لوگوں نے شرکت کی۔

مسئلہ خلق قرآن: مامون رشید کی سرپرستی میں معتزلہ کے عقیدہ خلق قرآن کو عروج ہوا۔ مامون نے پوری امت سے اس پر اقرار کرنے کے لیے کہا لیکن بعض علماء نے اس سے انکار کر دیا جن میں امام احمد بن حنبل بھی تھے۔ ۲۱۸ھ میں والی بغداد سعد بن ابراہیم نے ان کو گرفتار کر کے مامون کے پاس روانہ کیا لیکن یہ راستے میں ہی تھے کہ مامون کا انتقال ہو گیا لیکن وہ خلیفہ معتصم کو اس کے بارے میں وصیت کر گیا تھا۔ امام صاحب کو سزا کے طور پر ۲۸ کوڑے مارے گئے ہر جلاد دو کوڑے کے بعد بدل جاتا اور امام صاحب کہتے کہ میرے سامنے قرآن وسنت سے کوئی دلیل پیش کروتا کہ میں مان لوں۔ امام صاحب کو ۲۸/ہفتے تک قید میں رکھا گیا اس عرصہ میں ۳۴/کوڑے اور مارے گئے امام بخاری کہتے ہیں کہ میں نے سنا کہ امام احمد کو ایسے کوڑے لگائے گئے کہ اگر ایک کوڑا ہاتھی کو لگتا تو وہ چیخ مار کر بھاگ جاتا۔ امام صاحب کہتے ہیں کہ جس وقت مجھے کوڑا مارنے کے لیے لے جایا گیا تو ایک شخص نے پیچھے سے کہا کہ میں ابوالہشیم ڈاکو ہوں اور چوری و ڈاکہ کے جرم میں ہزاروں کوڑے کھا چکا ہوں لیکن آج تک باز نہیں آیا۔ تم راہ خدا کے لیے سزا بھگت رہے ہو سچائی سے مت ہٹنا اس ڈاکو کی گفتگو نے ہمت پیدا کر دی اور دعاء مغفرت کرتے رہے۔ خلیفہ متوکل کے دور میں جب معتزلہ کا زور کم ہوا تو ان کو رہا کیا گیا۔ علی بن مدینی جو امام بخاری کے استاذ ہیں

فرماتے ہیں کہ اللہ تعالی نے فتنہ ارتداد کے زمانے۔ میں ابوبکر صدیقؓ کے ذریعہ اسلام کی مدد کی اور فتنہ خلق قرآن میں احمد بن حنبلؒ کی وجہ سے اسلام کو بچالیا۔

تصنیفات

امام احمد بن حنبل کی مشہور تصنیفات میں رسالہ صلوٰۃ، کتاب الظہر، کتاب حدیث شعبہ، کتاب ابی فضل ابی بکر صدیق، کتاب فضائل حسنین، فضائل الصحابۃ، کتاب ناسخ و منسوخ، کتاب مسلک الکبیر، کتاب مسلک الصغیر اور کتاب التاریخ مشہور ہیں۔

مسند امام احمد بن حنبل: امام احمد کی تالیفات میں مسند احمد کو خاص شہرت اور مقام حاصل ہے۔ امام احمدؒ نے سولہ سال کی عمر سے روایات جمع کرنی شروع کردی تھیں۔ ۱۸۰ھ سے مسند لکھنے کا آغاز کیا اور ساڑھے سات لاکھ سے زیادہ احادیث جمع کر کے اس مجموعہ میں سات سو صحابہ کی تیس ہزار سے زیادہ حدیثیں نقل کی ہیں۔ حنبلؒ بن اسحاق کا بیان ہے کہ امام احمد نے ہم سے کہا کہ یہ مجموعہ میں نے ۷/لاکھ سے بھی زیادہ احادیث کے ذخیرے میں سے منتخب کیا ہے اور یہ انتخاب اس لیے کیا ہے تاکہ مسلمانوں کے لیے احادیث کا ایک معیار قائم ہو۔ مسند کا مسودہ امام احمد نے خود لکھا مگر اس کی تکمیل و ترتیب کی مہلت نہ مل سکی۔ اسے آپ کے بیٹے امام عبداللہ نے مکمل و مرتب کیا۔

خصوصیات

۱۔ مسند کی ترتیب مضامین کے لحاظ سے نہیں رکھی گئی ہے بلکہ ہر حدیث کو اس صحابی کی روایتوں میں درج کیا گیا ہے جس سے وہ مروی ہے۔

۲۔ مسند میں کسی حدیث کے ہونے سے یہ ضروری نہیں ہے کہ امام احمد کا اس پر

عمل بھی ہے۔

۳۔ کہا جاتا ہے کہ تقریباً دو سوایسے صحابہ کرامؓ کی روایات اس میں درج ہونے سے رہ گئی ہیں جن سے صحیحین میں احادیث مروی ہیں۔ مسند میں تقریباً سات سو صحابہؓ کی روایات ہیں اور ہر صحابہ کی مرویات الگ الگ ہیں۔

۴۔ مسند احمد حدیث کا سب سے بڑا مجموعہ ہے۔ اس میں تقریباً تین ثلاثی روایات ہیں۔

۵۔ آپ نے صرف ثقہ راویوں کی روایات کو قبول کیا ہے۔ آپ احادیث پر زیادہ اعتماد کرتے تھے اس لیے بعض علماء آپ کو فقیہ سے زیادہ محدث قرار دیتے ہیں۔ مگر آپ کا شمار فقہاء اربعہ میں ہوتا ہے۔ علماء نے مسند احمد کی ترتیب وتبویب کی طرف توجہ دی۔ موجودہ دور میں احمد بن عبد الرحمٰن البنا نے اسے ابواب پر مرتب کیا ہے۔ جو الفتح الربانی کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ شیخ احمد شاکر نے اس کی تحقیق وترتیب کی طرف توجہ دی لیکن تکمیل سے پہلے ان کا انتقال ہوگیا۔ صرف چند جلدیں ہی شائع ہوسکیں۔ حافظ ابوالحسن بن علی بن ابوبکر ہثیمی نے مسند کی ان روایات کو جو صحاحِ ستہ سے زائد ہیں ابواب پر مرتب کیا۔ ابوالحسن بن الہادی نے اس کی ضخیم شرح لکھی۔ اور بعض علماء نے مسند کا اختصار بھی کیا ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ کے نزدیک مسندؒ کی تخریج روایات کی شرط ابوداؤد کی شرط سے قوی ہے۔ حافظ ابن حجر کے نزدیک مسند میں کوئی ایسی حدیث نہیں جو بے اصل ہو سوائے تین یا چار احادیث کے۔

فقہ حنبلیؒ: امام احمد کا مذہب چار مشہور مذاہب میں سے ایک ہے۔ آپ کی فقہ، فقہ حنبلی کے نام سے معروف ہے۔ اس فقہ کے بنیادی اصول پانچ ہیں۔

۱۔ جب کسی مسئلہ میں واضح نص موجود ہو تو کسی کے اختلاف کی پرواہ نہ کی جائے۔

۲۔ جب کسی مسئلہ میں صحابی کا فتویٰ معلوم ہو جائے اور اس کے خلاف کسی صحابی کا قول نہ ہو تو پھر اسی کو اختیار کیا جائے۔ امام صاحب کے نزدیک صحابہؓ کے فتاویٰ کی اہمیت حدیث مرسل سے بھی زیادہ تھی۔

۳۔ جس مسئلہ میں صحابہ کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہو اس میں اس قول کو اختیار کیا جائے جو کتاب وسنت سے زیادہ قریب نظر آئے۔ اگر ترجیح ثابت نہ ہو سکے تو پھر صحابہ کرامؓ کے مختلف اقوال نقل کر دے، کسی ایک قول کو خاص نہ کرے۔

۴۔ اگر کسی مسئلہ میں ضعیف یا مرسل حدیث موجود ہو تو اسے بھی قیاس پر ترجیح دی جائے۔ بشرطیکہ اس مسئلہ میں کوئی دوسری حدیث، صحابی کا قول یا اجماع مخالف نہ ہو۔

۵۔ قیاس اس وقت جائز ہے اور وہ بھی اتنا جتنا ضروری ہو جب کسی مسئلہ میں منقول چیزیں نہ ہوں۔

☆☆☆

تاریخ وارتقاء فقہ

عہد رسالت میں صحابہ کرام حضور اکرم ﷺ سے مسائل معلوم کرلیا کرتے تھے لیکن عہد رسالت کے بعد صحابہ کرامؓ کی ایک بڑی جماعت اشاعت اسلام کی غرض سے دور دراز کے علاقوں میں سکونت پذیر ہوگئی۔ علاقائی مسائل وحالات مختلف ہونے کی وجہ سے نئے پیش آنے والے مسائل میں صحابہ کرامؓ قرآن وحدیث میں واضح حکم نہ ملنے کی صورت میں اجتہاد سے کام لیتے تھے۔ فقہ میں حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ، حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ، حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ، حضرت زیدؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت ابو درداءؓ، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور حضرت عائشہؓ وغیرہ مہارت رکھتے تھے۔

ان میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے اجتہاد سے فقہ مالکی، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے علوم سے فقہ شافعی اور حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ کے اجتہاد سے فقہ حنفی کا قیام عمل میں آیا۔ حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ حضور اکرم ﷺ سے قربت رکھتے تھے عہد فاروقی میں حضرت عمرؓ نے کوفہ میں تعلیم دینے کے لیے ان کو بھیجا تھا۔ ''جب حضرت علیؓ نے دار الخلافہ کوفہ منتقل کیا اور ان سے ملے تو خوش ہو کر فرمایا کہ ''ان کے شاگرد اس بستی کے چراغ ہیں'' ان میں علقمہ جو حضرت عائشہؓ سے بھی استفادہ کرتے تھے بہت مشہور ہوئے علقمہ کی وفات کے بعد ابراہیم نخعی مسند درس پر بیٹھے ان کے بعد امام حماد ان کے جانشین

ہوئے۔ان کی وفات کے بعد امام ابوحنیفہؒ ۱۲۰ھ میں مسند درس پر متمکن ہوئے۔

امام ابوحنیفہؒ نے مسائل کے حل کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اپنی ذاتی رائے کی جگہ انھوں نے اپنے چالیس شاگردوں کی ایک جماعت بنائی، جب کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو اس مجلس میں آزادانہ بحث کی جاتی اور اگر سب متفق ہوتے تو لکھ لیا جاتا ورنہ سب کی رائے الگ الگ تحریر کردی جاتی۔ یہ کام تقریباً تیس سال تک چلتا رہا جس میں تقریباً ۸۳ ہزار مسائل جمع کئے گئے۔آپ کے مشہور شاگردوں میں امام زفر، امام محمد، داؤد طائی، امام ابو یوسف، یحیٰ بن زکریا اور قاسم بن معن وغیرہ ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کی وفات کے بعد امام محمد نے ان مسائل کو جامع الصغیر کے نام سے مدون کیا۔امام ابوالحسن احمد بن محمد بن جعفر بن ہمدان بغدادی القدوری (۳۶۲ھ۔۴۲۸ھ) نے امام ابوحنیفہ کے مسائل میں اختلافات کو پہلے بغیر دلائل کے اور پھر دلائل کے ساتھ تقریب کے نام سے جمع کیا۔اس کے بعد اس کی شرح (قدوری) میں معتبر اور مستند مسائل جمع کر کے مختلف آراء کو ایک دوسرے پر ترجیح دی اور اس کے بعد قدوری کی شرح الکتاب کے نام سے تیار کی۔ یہ علماء و فقہاء کے نزدیک معتبر اور عمدہ متن تھا۔

علی بن ابی بکر بن عبد الجلیل الفرغانی المرغینانی متوفی ۵۹۲ھ آپ کی کنیت ابو الحسن اور لقب برہان الدین ہے سلسلۂ نسب حضرت ابوبکرؓ سے ملتا ہے، نے امام محمد کی جامع الصغیر اور امام قدوری کی مختصر القدوری کو سامنے رکھ کر جامع الصغیر کی ترتیب پر فقہ حنفی کی ایک شرح بدایۃ المبتدی کے نام سے تیار کی جس کی شرح اسی (۸۰) جلدوں میں کفایۃ المنتہی کے نام سے مکمل کی۔ لیکن طوالت کے مدنظر چار جلدوں میں ایک دوسری شرح ''ہدایہ'' لکھی جس میں عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ مختلف روایات کی ترجیح کو واضح کر کے ائمہ کے اختلافات کو بیان کیا گیا ہے۔

☆☆☆

ہندوستان میں فقہ اسلامی

اسلام کی شعائیں عرب سے نکل کر عجم کی سرزمین میں پہونچیں تو اسلام کو نئی تہذیب وتمدن سے واسطہ پڑا۔ مسائل کی وسعت کے پیش نظر علم فقہ میں بھی وسعت آئی۔ اور علماء وفقہاء نے ان مسائل کو حل کرنے میں اپنی کاوشوں کا دائرہ وسیع کیا ۱۵ھ عہد فاروقی میں حکم بن العاص کی قیادت میں اسلامی فوج ہندوستان میں داخل ہوئی اور یہاں کے باشندے اسلام سے روشناس ہوئے۔ اس کے بعد ۲۵ھ میں حضرت عثمانؓ کے عہد میں عبداللہ بن عامر نے کابل کو فتح کیا۔ امیر المؤمنین حضرت علیؓ کے دور خلافت ۳۸ھ میں کوہستان قلات کو فتح کیا۔ حضرت امیر معاویہؓ کے عہد حکومت ۴۴ھ میں مہلب بن ابی صفرہ نے درہ خیبر فتح کیا اس وقت تک مسلمانوں نے ان علاقوں کو فتح کرنے کے بعد یہاں سکونت اختیار نہیں کی تھی البتہ ہندوستانی عربوں کی قوت سے واقف ہو چکے تھے۔

اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے عہد حکومت میں محمد بن قاسم ۷۱۱ء نے جب سندھ کو فتح کیا تو اس کے بعد مسلمانوں نے نہ صرف یہاں سکونت اختیار کی بلکہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں حکومت قایم کی۔ مسجدوں اور مدارس کا قیام عمل میں آیا۔ حجاج بن یوسف نے محمد بن قاسم کو اشاعت اسلام کی ہدایت بھی کی تھی۔ لہذا ہندوستان کے دوسرے باشندوں کے ساتھ ساتھ مولانا اسلام دیبلی نے بھی محمد بن قاسم کے ہاتھ پر

اسلام قبول کیا۔ محمد بن قاسم اپنے ساتھ علماء وفقہاء کی ایک بڑی جماعت لے کر آیا تھا۔ جنھوں نے ہندوستان میں سکونت اختیار کی ان میں اسرائیل بن موسیٰ بصری، قاضی موسیٰ بن یعقوب ثقفی، عبداللہ بن محمد علوی، عمرو بن مسلم باہلی وغیرہ مشہور ہیں ان کے علاوہ یہاں کے باشندوں میں ابومعشر نجیح بن عبدالرحمٰن سندھی، ابراہیم بن محمد دیبلی اور ابوالقاسم شعیب بن محمد دیبلی جیسے علماء وفقہاء نے ہندوستان میں علوم اسلامی کوفروغ دیا۔ اور خاص کر علم فقہ سے اہل ہند کوروشناس کرایا۔

عہد سلطنت التمش کی حکومت میں مولانا احمد حسن صغانی لاہوری، شرف الدین اور دوسرے نامور علماء مسند علم پر فائز تھے۔ غیاث الدین بلبن کے عہد میں یوسف بن ابی بکر ملتانی، شیخ اسحاق بن بخاری، قاضی رفیع الدین، مولانا برہان الدین بیزار جیسے علماء علوم اسلامی کا درس دینے پر مامور تھے۔ غرض کسی بھی حکمراں کی سلطنت رہی ہو اس خطہ میں علوم اسلامی کا چرچا عام رہا۔ خاص طور سے علم حدیث اور فقہ کو عروج حاصل ہوا۔ علماء اور فقہاء کو عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ جنھوں نے اپنے آپ کو ان علوم کی نشرواشاعت کے لیے وقف کردیا تھا۔ اور بہت سے سلاطین امراء اور وزراء کے لیے کتابیں لکھیں۔ یہ علماء تمام فقہی مسالک کا برابر احترام کرتے تھے۔ لیکن فقہ حنفی کو سب سے زیادہ فروغ ہوا۔ فتاویٰ فیروز شاہی، فتاویٰ نقشبندیہ (معین الدین اجمیری)، فتاویٰ غیاثیہ (شیخ داؤد بن یوسف الخطیب)، فتاویٰ قراخانی (مولانا صدرالدین)، فتاویٰ تاتارخانیہ (عالم بن علا حنفی)، فتاویٰ حمادیہ (ابوالفتح دکن بن حسام ناگوری)، فتاوی ابراہیم شاہی (احمد بن حمید)، فتاویٰ امینیہ (محمد امین بن عبداللہ) المتانۃ فی حرمۃ الخزانۃ (محمد جعفر بربکائی) جیسے شاہکار لکھے گئے۔ اس کے علاوہ فتاویٰ بابری (شیخ نور الدین خوانی) اور فتاویٰ عالمگیری کو ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب نے شیخ نظام الدین برہان پوری سے علماء کے ایک بورڈ کے ذریعہ مرتب کرایا۔

ہندوستان میں ہدایہ کے اثرات

عالم اسلام میں چار فقہی مسالک کو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ البتہ کسی ایک علاقہ میں صرف ایک ہی مسلک زیادہ رائج ہوا۔ مثلاً اندلس اور شمالی افریقہ کے مغربی حصہ میں لوگ فقہ مالکی پر عمل کرتے ہیں۔ حجاز و یمن کے باشندوں نے فقہ شافعی کو اختیار کیا۔ نجد میں فقہ حنبلی اور عراق و ماوراء النہر، آذربائیجان، خوارزم، افغانستان اور ہندوستان میں فقہ حنفی کو مقبولیت حاصل ہوئی۔

۱۲۵۸ء میں منگولوں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی کے بعد ترکوں کو عروج حاصل ہوا۔ علماء، فقہا اور صوفیا کی ایک بڑی تعداد پر سکون جگہ کی تلاش میں ماوراء النہر سے ہجرت کر کے ہندوستان آئی۔ اس وقت شہاب الدین غوری کے تُرک غلام قطب الدین ایبک نے دہلی میں غلام سلطنت کی بنیاد ڈالدی تھی چونکہ ترک فقہ حنفی پر عمل کرتے تھے اس لیے ہندوستان کے بقیہ مسلمانوں نے بھی ان کی اقتداء میں فقہ حنفی کو اختیار کیا۔

محمد تغلق کے عہد میں فتاویٰ تاتارخانیہ مدون ہوا۔ اس کے بعد فتاویٰ حمادیہ ہدایہ کے طرز پر مدون ہوا۔ دسویں صدی ہجری میں شہاب الدین احمد بن محمد نے سلطان ابراہیم عادل شاہ کے لیے ''ابراہیم شاہیۃ الفتاویٰ الحنفیہ'' لکھی اس کے بعد اورنگ زیب کے دور میں فتاویٰ جامع البرکات کو ابوالبرکات نے مدون کیا۔ نیز اورنگ زیب کے حکم سے شیخ نظام الدین برہان پوری کی قیادت میں علماء فقہاء کی ایک جماعت نے تقریباً دولاکھ روپے خرچ کر کے ہدایہ کی ترتیب پر فتاویٰ عالمگیری کو مرتب کیا۔ علماء کی اس جماعت میں قاضی محمد جونپوری، شیخ علی اکبر حسینی، اسعد اللہ خان خانی، شیخ ابو حامد جونپوری اور مفتی محمد اکرم حنفی لاہوری وغیرہ مشہور ہیں۔

ترک اور ماوراء النہر کے علماء کا رجحان فقہ حنفی پر ہونے کی وجہ سے عہد سلطنت سے ہی ہندوستان میں سلاطین ہند نے مدرسوں کے نصاب اور عدالتوں میں فقہ حنفی کی معتبر کتاب ہدایہ کو بنیاد بنایا۔ یہ سلسلہ مغل (ترک) بادشاہوں کے عہد تک جاری رہا، حتیٰ کہ جتنے بھی فتاویٰ مرتب ہوئے سب میں ترتیب ہدایہ ہی کی رہی۔ آج بھی آزاد ہندوستان میں مسلمانان ہند کے مسائل ہدایہ کی روشنی میں حل کیے جاتے ہیں۔

فتاویٰ تاتارخانیہ

تعارف: فتاویٰ تاتارخانیہ فقہ کے موضوع پر ایک مشہور کتاب ہے، اس کے مصنف شیخ امام فرید الدین عالم بن علا حنفی متوفی ۷۸۶ھ نے مرتب کیا تھا۔ اسلامی ہند کا یہ فقہی ذخیرہ اس وقت صرف احمد آباد کے کتب خانہ پیر محمد شاہ میں مکمل موجود ہے۔ اس کی تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

کتاب کا نام: اس کتاب کا نام ''زاد السفر'' اور ''زاد المسافر'' بھی ہے۔ حاجی خلیفہ ایک ترکی مصنف نے اس کا نام ''زاد المسافر فی الفروع'' لکھا ہے، جس کی تلخیص ابراہیم بن چیلپی نے ۹۵۶ھ میں کی تھی۔ مصنف فقہ، اصول اور عربی ادبیات کے مشہور عالم تھے۔ آپ نے ۷۷۷ھ میں ''زاد السفر'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جسے ہندوستان کا بادشاہ فیروز شاہ تغلق اپنے نام سے موسوم کرانا چاہتا تھا، لیکن مصنف کے تعلقات امیر تاتارخان سے تھے، اس لیے اس کا انتساب تاتارخان کے نام پر فتاویٰ تاتارخانیہ رکھا۔

خصوصیات: ۱- اس کے ماخذ میں ۲۷ / کتابوں کے نام درج ہیں، اس میں المحیط البرہانی، الذخیرہ، الظہیریہ کے مسائل مرتب کیے گئے ہیں۔ محیط کے لیے ''م'' اور باقی کتابوں کے نام درج ہیں۔

۲- شروع کا باب علم کے متعلق ہے اور کتاب، ابواب وغیرہ کی تقسیم ہدایہ کی

ترتیب کے مطابق رکھی گئی ہے۔

۳۔اس میں ہر مسئلہ میں مفتیان کرام کے اختلافات باقاعدہ نقل کیے گئے ہیں نیز ان کوفتویٰ کی طرف منسوب کر کے فتویٰ اور مفتی کی صراحت کردی گئی ہے۔

۴۔اس کی پہلی جلد کتاب الطہارت سے کتاب الوقف تک سو ابواب پر مشتمل ہے اور دوسری جلد کتاب الکفالۃ سے کتاب الوصایا کے مضامین تک ہے اس کے علاوہ ایک جلد کتاب البیوع، کتاب الطلاق، کتاب الحدود، کتاب المفقود وغیرہ کے مضامین پر مشتمل ہے۔

فتاویٰ عالمگیری

تعارف: فتاویٰ عالمگیری کو مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے حنفی علماء کی ایک جماعت کے ذریعہ دولاکھ روپے خرچ کر کے مرتب کرایا۔ یہ چھ ضخیم جلدوں میں عربی زبان میں ہے۔اس کے بعد بادشاہ نے اس کے بہت سے نسخے کرا کر حجاز، مصر، شام، روم وغیرہ بھیجے۔اور ہندوستان کے قاضیوں کو حکم دیا کہ دیانتداری کے ساتھ اسی کے مطابق فیصلہ کریں۔اس میں عبادات و معاملات دونوں پہلوؤں کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اس میں مختلف عنوانات ''کتاب'' کے لفظ سے بیان کیے گئے ہیں اور عنوانات کو الگ الگ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے ہر باب کو فصل میں تقسیم کیا گیا ہے نیز باب کے شروع میں مسئلہ کے معنی و مطلب کی تشریح کردی گئی ہے۔اس میں ہر مسئلے کے مآخذ کا حوالہ دیا گیا ہے۔اگر اصل کتاب دستیاب نہ ہوسکی تو مسئلہ کسی دوسری کتاب سے نقل کر کے فلاں عن فلاں لکھ کر اس کتاب کا ذکر کردیا ہے۔

فقہی اہمیت: فتاویٰ عالمگیری فقہ حنفی کی ترتیب پر مرتب کئے گئے ہیں یہی وجہ

ہے کہ اس میں بیان کئے گئے مسائل فقہ حنفی کی ان چھ مشہور کتابوں سے اخذ کئے گئے ہیں جن کو امام محمد نے لکھا ہے۔ انھیں ظاہر الروایات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ کتابیں (۱) جامع الکبیر (۲) جامع الصغیر (۳) المبسوط (۴) الزیادات (۵) السیر الکبیر (۶) السیر الصغیر فقہ حنفی کی بنیادی کتابیں ہیں۔ اور فتاویٰ عالمگیری ان کتابوں کے ساتھ ساتھ دوسری تمام فقہ کی کتابوں کا نچوڑ ہے اسی لیے عالم اسلام میں اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے کیونکہ اس کی ترتیب علماء دین اور فقہاء کرام کی ایک ایسی بڑی جماعت کی کوششوں کا نتیجہ ہے جو عالم دین کے ساتھ ساتھ نہایت زاہد، پرہیزگار اور متقی لوگ تھے۔

ترتیب و اشاعت: عالم گیر نامہ میں محمد کاظم بن محمد امین نے بیان کیا ہے کہ عالم گیر چالیس سال کی عمر میں ۱۰۶۸ھ میں حکمراں بنا اور ۱۰۷۷ھ میں انچاس سال کا ہوا۔ اسی سال فتاویٰ عالمگیری کی تالیف شروع ہوئی اور دو سال کی مدت میں مکمل ہوئی۔ اورنگ زیب کے پاس اپنا ایک کتب خانہ تھا جو اس کے آباء واجداد کے زمانہ سے چلا آرہا تھا۔ شاہجہان کو کتابوں کا بہت شوق تھا اور اورنگ زیب کو یہ شوق ورثہ میں ملا تھا۔ اس نے کتب خانہ کو خوب ترقی دی۔ جن علماء کو فتاویٰ عالمگیری کی ترتیب کی ذمہ داری سونپی گئی تھی ان کا تعلق بھی اسی کتب خانہ سے تھا۔ اس دور کے مشہور عالم شیخ نظام برہانپوری کے مشورہ سے علماء کا تقرر کیا گیا۔ اور ان کو ہی یہ ذمہ داری سپرد کی گئی۔ آپ دکن سے ہی اورنگ زیب کے مشیر خاص تھے آپ کے چار معاون علماء میں قاضی محمد حسین جونپوری، سید علی اکبر سعد اللہ خانی، شیخ حماد جونپوری اور مفتی محمد اکرم لاہوری کو فتاویٰ کے چار حصے کر کے الگ الگ تقسیم کر دیا گیا جس کو شیخ نظام برہان پوری نے اپنی نگرانی میں دو سال میں مکمل کرایا۔ اس کے نتیجے میں آپ کے منصب میں اضافہ کر کے درباری تکلفات سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔

فتاویٰ عالمگیری ہندوستان میں علم فقہ کی پہلی تفصیلی کتاب ہے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں اس کے ترجمے کیے گئے ہیں اور کئی بار کتابت وطباعت ہو چکی ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے مختلف ادوار میں فتاویٰ ترتیب دیے گئے لیکن وہ صرف قلمی کتاب تک ہی محدود رہ گئے۔ اس کا پہلا فارسی ترجمہ ترکی کے عالم عبداللہ چیلپی سے کرایا گیا۔ اس کے بعد دوسرے فارسی مترجم قاضی نجم الدین علی خاں کاکوروی نے کتاب الجنایات کا مع مختصر شرح کے ترجمہ کیا۔ اردو میں ترجمہ کا کام مولانا سید امیر علی ملیح آبادی نے انجام دیا۔

☆☆☆

اہم سوالات

۱۔ فقہ کی تعریف بیان کیجئے؟

۲۔ علم فقہ کے ارتقاء پر روشنی ڈالئے؟

۳۔ فقہ کے بنیادی ماٰخذ کو بیان کیجئے؟

۴۔ فقہاء اربعہ سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

۵۔ فقہاء اربعہ کے حالات زندگی اور ان کی خدمات کا جائزہ لیجئے؟

۶۔ ہندوستان میں علم فقہ کو کیسے عروج حاصل ہوا؟

۷۔ ہدایہ کا تعارف کراتے ہوئے اس کی اہمیت کو واضح کیجئے؟

۸۔ ہندوستان میں ہدایہ کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟

۹۔ فتاویٰ تاتارخانیہ کا تعارف کرایئے؟

۱۰۔ فتاویٰ عالمگیری کیسے وجود میں آیا؟ اس کا تعارف کرایئے؟

☆☆☆

کتب برائے مطالعہ

۱۔ فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر	مولانا تقی امینی
۲۔ تاریخ فقہ اسلامی	مولانا عبدالسلام ندوی
۳۔ تدوین فقہ	مولانا مناظر احسن گیلانی
۴۔ ائمہ اربعہ	مولانا ابوالعرفان ندوی
۵۔ تاریخ فقہ اسلام	مترجم عبدالرحیم
۶۔ فلسفہ شریعت اسلام	ڈاکٹر صبحی محمصانی مترجم مولوی محمد احمد رضوی
۷۔ تاریخ علم فقہ	مولانا عمیم الاحسان
۸۔ اصول فقہ اسلام	سید عبدالرحیم مترجم مولوی مسعود علی
۹۔ اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل	مولانا امین احسن اصلاحی
۱۰۔ اسلامی فقہ مکمل	مولانا منہاج الدین
۱۱۔ اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ	مولانا صدرالدین اصلاحی

☆☆☆

باب چہارم

تصوف

تعارف: رسول اکرم ﷺ جس دین حق کی طرف دعوت دینے کے لیے بھیجے گئے تھے اس کا بہترین نمونہ خود آپ ﷺ کی ذات مبارک اور طریقۂ زندگی تھا۔ آپ ﷺ نے جہاں ایمانیات، عبادات کے سلسلے میں رہنمائی فرمائی ہے وہاں اخلاقیات، روحانیات اور تزکیہ نفس پر بھی زور دیا ہے۔ غرض ایمان اور عبادات کی طرح یہ بھی دین کا ایک اہم جز ہے۔ یہی تصوف وسلوک کا خاص موضوع ہے تصوف کی اصل تزکیۂ نفس اور احسان ہے جو قرآن وسنت سے ثابت ہے۔ نبی کریم ﷺ کو مبعوث کرنے کا مقصد ہی قرآن اور حکمت کی تعلیم دینا اور تزکیۂ نفس تھا۔

حضور اکرم ﷺ نے احسان کی تعریف اس طرح فرمائی کہ ''اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو اگر ایسا نہ ہو سکے تو یہ سمجھو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔''

دراصل قرآن وحدیث کی وہ تعلیمات مثلاً ہر چیز سے زیادہ اللہ تعالی کی محبت، اس کا خوف، ملاقات کا شوق، دنیا کی خواہشات کا خاتمہ، اللہ پر بھروسہ وغیرہ کا تعلق نہ عقائد سے ہے نہ اعمال سے بلکہ یہ سب دل کی کیفیت اور حالت کا نام ہے یہ ہی تصوف

کی حقیقت ہے۔

تعریف: تصوف کی تعریف میں علماء کرام کے اقوال درج ذیل ہیں:

شہاب الدین سہروردیؒ فرماتے ہیں کہ ''صوفیا کرام وہ حضرات ہیں جنھوں نے سنت کو زندہ کیا اور اپنے دلوں کو کینہ و بغض سے پاک رکھا۔''

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ ''اپنے نفس پر قابو پانے، علم و عقل سے اللہ تعالیٰ تک پہونچنے اور اپنے قول و فعل اور ہر حال میں رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرنے کا نام تصوف ہے۔''

غرض یہ کہ تصوف ایک ایسا علم ہے جس سے تزکیۂ نفس، اخلاق کی درستگی اور باطن کی اصلاح کی جاتی ہے اور اس کا مقصد آخرت کی کامیابی ہے۔

وجہ تسمیہ: صوفی کی تشریح علماء نے مختلف طرح سے کی ہے۔

۱۔ ''صفہ'' سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے چبوترہ۔ اصحاب صفہ حضور اکرم ﷺ کے وہ صحابہ کرامؓ ہیں جو دنیاوی زندگی کو خیر آباد کہہ کر مسجد نبوی کے ایک چبوترے پر دن رات عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ ذکر الٰہی، عبادت اور ریاضت کی وجہ سے ان کو یہ نام دیا گیا۔

۲۔ ''صفا'' سے نکلا ہے جس کے معنی پاکیزگی اور صفائی قلب کے ہیں۔ صوفی پاکیزگی نفس کی اہمیت پر زور دیتے ہیں اس لیے انھیں صوفی کہا گیا ہے۔

۳۔ ''صف'' سے نکلا ہے صوفیا چونکہ صف اول کے لوگ سمجھے جاتے ہیں اور نماز باجماعت میں اگلی صف میں کھڑے ہونے کو افضل تسلیم کرتے ہیں تاکہ قیامت کے

دن یہ نیک لوگوں کی صف میں آگے ہوں اس لیے ان کو صوفی کہا گیا۔

۴۔ شیو صوفیا کے معنی ہیں حکمت و دانائی۔ چونکہ یہ حکمت الٰہی میں معلم مانے جاتے تھے اس لیے صوفی کہلائے۔

۵۔ اس کا تعلق عربوں کے قدیم قبیلہ ''صوفانہ'' سے ہے جو خانہ کعبہ کا خادم تھا۔

۶۔ ''صفوت القفا'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں گدی کے بال چونکہ یہ لمبے بال رکھتے تھے اس لیے صوفی کہلائے۔

۷۔ ''صوف'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں اون یا پشمینہ دنیا کی اقوام اونی لباس سادگی اور درویشی کی علامت سمجھتی ہیں۔ صوفیاء اس لباس کو پسند کرتے تھے اور اکثر حلقوں میں یہ امتیازی لباس رہا ہے۔ اس لیے صوفی کہلائے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''تم لباس صوف پہنا کرو کہ اس سے تم اپنے دلوں میں حلاوت محسوس کرو گے''

شیخ ہجویری کے مطابق عربی لغت کی رو سے ''صفا'' سے صفوی۔'' صفہ سے صفی اسی طرح صف سے صفی بن سکتا ہے صوفی نہیں۔ صوفانہ سے صوفانی بنتا ہے نہ کہ صوفی۔ اس لیے صوفی کو صوف سے ماخوذ بتاتے ہیں۔

☆☆☆

تصوف کا ارتقاء

اسلام میں روحانی زندگی کی شروعات حضور اکرم ﷺ سے ہوتی ہے۔ آپ ﷺ دن ورات کا ایک بڑا حصہ غار حرا میں عبادت و ریاضت میں گزارتے تھے۔ جہاں سے نبوت کا آغاز ہوا۔ آپ ﷺ کی تربیت یافتہ صحابہ کرامؓ کی جماعت بھی یاد الٰہی میں مشغول رہتی۔ ہجرت مدینہ کے بعد مسجد نبوی میں صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت (اصحاب صفہ) نے تو اپنے آپ کو عبادت و ریاضت کے لیے ہی وقف کر دیا تھا۔ قرآن کریم میں ارشاد باری تعالی ہے کہ:

''(اے نبی) کہد و اگر واقعی تم اللہ سے محبت کرنے والے ہو تو چاہئے کہ میری پیروی کرو اللہ تم سے خود محبت کرے گا۔ (سورۃ آل عمران۔ آیت ۲۹)

قرآن کریم میں جن وانس کی تخلیق کا مقصد اس طرح بیان کیا ہے کہ:

''اور میں نے جنات اور انسانوں کو اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں''۔

(سورۃ الذاریات، آیت ۵۷-۵۶)

قرآن کریم میں ایک دوسری جگہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

''پس تم اللہ کی یاد میں لگ جاؤ کھڑے، بیٹھے اور لیٹے بھی''

(سورۃ النساء، آیت-۱۰۳)

رسول اکرم ﷺ کا سیاسی نظام مکمل طور پر اسلام کے اصولِ مساوات کا آئینہ

دار تھا۔ حکومت کا سارا کام صحابہ کرامؓ کے مشورہ سے ہوتا اور بیت المال پر قوم کے ہر فرد کا برابر حق تھا۔ قانونِ تعزیرات سب کے لیے یکساں تھے۔ خطبہ حجۃ الوداع میں آپ ﷺ نے اسلامی سماج اور سیاست کے سبھی بنیادی اصول پوری وضاحت کے ساتھ بیان فرما دیے تھے۔

حضور اکرم ﷺ کے بعد خلفائے راشدین نے پوری طرح آپ ﷺ کے طریقہ کی پیروی کی اور نظام خلافت نبی اکرم ﷺ کی سنت پر ترتیب دیا اور اسی کے مطابق اتباع کی۔ لیکن حضرت عثمانؓ کی شہادت سے صحابہ کرامؓ کا ایک طبقہ غمگین ہو کر گوشہ نشیں ہو گیا اور حضرت علیؓ کے عہد میں جنگ جمل اور صفین کے بعد تو صحابہ کرام کی ایک جماعت تمام دنیاوی معاملات سے کنارہ کش ہو گئی جس کا مقصد یہ تھا کہ ان حالات اور فتنوں سے الگ رہ کر اللہ تعالی سے لو لگائی جائے۔

دوسری طرف خلافت راشدہ کے بعد جو سیاسی نظام قائم ہوا وہ سنتِ نبوی ﷺ کے عین مطابق نہ تھا۔ بنی امیہ کے زمانہ میں خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی، بیت المال ذاتی ملکیت سمجھا جانے لگا۔ مسلمانوں کی دینی زندگی کی اصلاح و تربیت نظر انداز کر دی گئی۔ غرض مذہب و سیاست کے راستے ہی بدل گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کا دین دار طبقہ یہ خیال کرنے لگا کہ حکومت کی ملازمت اب دین کی خدمت نہیں رہی بلکہ دنیاداری کے مترادف ہو گئی لہذا بہت سے بزرگوں نے حکومت سے قطع تعلق کر لیا۔ پھر بنی امیہ کے زمانے میں کچھ ایسے ناخوشگوار واقعات ہوئے جنہوں نے ملت کے جذبات کو سخت صدمہ پہونچایا اور وہ حسرت سے نبی کریم ﷺ اور خلفائے راشدین کے زمانہ کو یاد کرتے تھے۔ مثلاً

نبی کریم ﷺ نے جب حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کی گورنری پر مامور کیا تو

فرمایا کہ:

''آسانی پیدا کرنا، دشواری پیدا نہ کرنا، لوگوں کو بشارت دینا اور ان کو وحشت زدہ نہ کرنا، باہم اتفاق رکھنا اور اختلاف نہ کرنا، لوگوں کے ساتھ خوش خلقی کا برتاؤ کرنا''۔

خلفائے راشدینؓ کا بھی یہی طریقہ کار رہا اگر کسی گورنر کے متعلق کوئی شکایت ملتی اور وہ درست پائی جاتی تو فوراً کارروائی کی جاتی۔ جب کہ عہد بنی امیہ میں گورنروں کا طرزِ عمل اس کے بالکل برعکس تھا۔ ابن زیاد اور حجاج بن یوسف کے ظلم وستم سے لوگ کانپ اٹھتے تھے۔ حجاج بن یوسف کے مظالم دیکھ کر خواجہ حسن بصریؒ کو اتنی تکلیف ہوئی کہ گیارہ سال تک گوشہ نشیں رہے اور جب اس کے مرنے کی خبر سنی تو سجدے میں گر گئے اور کہا ''اے اللہ میں تجھ سے ڈرتا ہوں اور اس سے ڈرتا ہوں جو تجھ سے نہیں ڈرتا''۔

ایک مرتبہ شام کے کچھ نبطیوں کو جزیہ ادا نہ کرنے کی سزا میں دھوپ میں کھڑا ہوا دیکھ کر حضرت ہشام بن حکیم بن جزامؓ نے فرمایا کہ:

''میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ خدا ان لوگوں کو عذاب دے گا جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں''۔

بہرحال ان لوگوں نے بنوامیہ کے خلاف خروج کے مقابلہ گوشہ نشینی کو ترجیح دی کیونکہ بنوامیہ کے خلاف بغاوت کا مطلب تھا کہ ملت اسلامیہ کی وحدت بکھر جاتی۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت ابوذر غفاریؓ جیسے مجاہد بھی ان حالات میں خاموشی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔

تصوف کے ارتقاء کو مندرجہ ذیل ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلا دور

۴۱ھ بنوامیہ کی حکومت کے شروع سے ۲۳۶ھ تک ہے۔ اس دور میں حضرت اویس قرنی متوفی ۳۷ھ، حضرت حسن بصری متوفی ۱۱۰ھ، مالک بن دینار متوفی ۱۲۱ھ، حضرت حبیب عجمی متوفی ۱۳۵ھ، خواجہ فضیل بن عیاض متوفی ۱۸۷ھ، حضرت ابراہیم ادہم متوفی ۱۶۳ھ اور عبدالواحد بن زید ۱۷۷ھ وغیرہ خاص طور پر مشہور ہیں۔

خصوصیات

۱۔ ان بزرگوں پر خشیت خداوندی کا بڑا غلبہ تھا۔ اس لیے توبہ پر بہت زور دیتے تھے۔ ایک رات حسن بصری اپنے گھر میں رو رہے تھے کسی نے سبب دریافت کیا اور کہا آپ تو بہت پرہیز گار ہیں۔ جواب دیا اس لیے روتا ہوں کہ شاید لاعلمی میں غیر ارادی طور پر مجھ سے کوئی کام غلط ہو گیا ہو یا میرا کوئی قدم نامناسب مقام پر رکھا گیا ہو۔ اور میرا یہ فعل بارگاہ خداوندی میں ناپسند ہو۔

۲۔ ان بزرگوں نے اپنے افکار و خیالات کو اجتماعی شکل دینے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی اصلاح کا کوئی نیا طریقہ اختیار کیا بلکہ یہ خراب ماحول سے الگ رہ کر عبادت کرنے کو زیادہ پسند کرتے تھے۔

۳۔ اس دور کے صوفیاء نے اپنے خیالات کا اظہار تصانیف کی شکل میں بہت کم کیا ہے۔ صرف عبداللہ ابن مبارک متوفی ۱۸۱ھ کی کتاب الزہد اور سفیان ثوری متوفی ۱۶۱ھ کی کتاب التفسیر ملتی ہے۔

۴۔ اس دور کے صوفیا نے اپنے آپ کو حکومت سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ خلفاء کی صحبت اور سرکاری ملازمت کو بری نظر سے دیکھتے تھے۔ بلکہ دینی خدمت کرنا پسند کرتے

تھے۔ اور اگر کبھی مجبوراً ملنا بھی پڑتا تھا تو نہایت جرأت اور ہمت کے ساتھ ان پر تنقید کرتے تھے۔ ایک مرتبہ خلیفہ ہارون رشید اپنے وزیر فضل کے ساتھ خواجہ فضیل بن عیاض کے گھر پر حاضر ہوا۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو معلوم کیا کون ہے؟ وزیر نے بتایا امیر المومنین۔ خواجہ فضیل نے جواب دیا "امیر المؤمنین کو مجھ سے کیا کام اور مجھے ان سے کیا واسطہ۔ وزیر نے کہا بادشاہ کی اطاعت واجب ہے۔ فرمایا مجھے حیران مت کرو۔ وزیر نے کہا مجھے اندر آنے کی اجازت دو ورنہ ہم حکماً اندر آجائیں گے۔ خواجہ نے فرمایا اجازت تو نہیں دیتا حکماً اندر آسکتے ہو۔ جب وزیر اور خلیفہ اندر گئے تو خواجہ نے چراغ بجھادیا تاکہ ہارون رشید کو دیکھ نہ سکیں۔ اتفاق سے ہارون کا ہاتھ ان سے چھوگیا تو فرمایا "کیسا نرم ہاتھ ہے کاش کہ دوزخ کی آگ سے بچ جائے"۔ یہ سن کر ہارون رشید رونے لگا اور اس کی ہچکی بندھ گئی"۔

اگر یہ بزرگ باطنی اصلاح و تربیت، تزکیۂ نفس اور عبادت و ریاضت وغیرہ پر زور نہ دیتے تو دین محض ایک سیاسی ضرورت بن کر رہ جاتا۔ ان بزرگوں کی کوششوں سے ہی اسلامی تعلیمات سماج میں پھیلیں۔

دوسرا دور

یہ دور بنو عباس کی حکومت کے آخری زمانہ تیسری صدی ہجری کا آخر و چوتھی صدی ہجری کی ابتداء سے شروع ہوتا ہے۔ اس وقت اسلامی دنیا میں چاروں طرف فلسفہ و عقلیت کا دور دورہ تھا۔ اور لوگوں کے ذہنوں میں خلش عقائد میں تذبذب اور ایمان میں شکوک و شبہات پیدا ہونے لگے تھے۔

اس دور کے صوفیاء نے عقلیت کے غلبہ سے عوام کو محفوظ رکھا۔ اس دور کے

صوفیاء میں حضرت بایزید بسطامی متوفی ۲۶۱ھ، حضرت ذوالنورین المصری م ۲۴۵ھ، حضرت جنید بغدادی م ۲۷۰ھ وغیرہ مشہور ہیں۔

خصوصیات

۱۔ اس دور کے صوفیاء نے معتزلہ اور دیگر عقلیت پسند گروہوں کی مخالفت میں عشق الٰہی پر زور دیا اور خود بھی محبت الٰہی میں سرشار ہو کر زندگی گزارنے لگے۔

۲۔ اس دور کے صوفیاء نے فلسفہ کی پیدا کی ہوئی ذہنی لامرکزیت کو قلبی کیفیات کے ذریعہ دور کرنے کی کوشش کی۔ اور کہا کہ قلب کو اگر یادِ الٰہی میں مشغول کر دیا جائے تو ذہنی الجھنیں خود بخود دور ہو جائیں گی۔ امام احمد بن حنبلؒ نے بھی ''کتاب الزھد'' میں محبت الٰہی پر زور دیا اور عقلیت کے مذموم اثرات کا علاج عشق خداوندی ہی میں بتایا ہے۔

۳۔ اس دور کے صوفیاء کا خیال تھا کہ اگر انسان ستاروں کی گزرگاہوں کو ڈھونڈنے کے بدلے اپنے افکار کی دنیا میں سفر کرے تو وہ اپنی شخصی وقومی دونوں زندگی کو بہتر بنا سکتا ہے۔ اور سورج کی شعاؤں کو گرفتار کرنے کے بجائے اگر اپنی اندھیری رات میں اجالا کرنے کی کوشش کرے تو اس سے بنی نوع انسان کو زیادہ فائدہ پہونچ سکتا ہے۔ جو مادی ترقی انسان کو معبود حقیقی سے دور لے جائے وہ ترقی نہیں زوال ہے۔ اس لیے ان بزرگوں نے عشق الٰہی سے عقلیت کا مقابلہ کیا۔

تیسرا دور

یہ دور عباسی حکومت کے خاتمہ کے وقت چوتھی صدی ہجری کے آخر اور پانچویں صدی ہجری تک کا ہے۔ اس دور کے صوفیاء میں شیخ ابوسعید ابن العربی م ۳۴۱ھ

شیخ ابوسعید ابن الخیر م ۴۴۵ھ، شیخ ابوالحسن فرقانی م ۴۲۵ھ، شیخ ابونصر سراج م ۳۷۸ھ، شیخ ابوطالب مکی م ۳۸۶ھ، شیخ ابوبکر، م ۳۹۵ھ اور شیخ ابوعبدالرحمان اسلمی م ۴۲۱ھ مشہور ہیں۔ ابن العربی نے "طبقات" شیخ ابومحمد الخلدی نے "حکایات الاولیاء"۔ ابوعبد الرحمان السلمی نے "طبقات الصوفیین" لکھیں۔ شیخ ابوبکر نے "کتاب التعارف لمذہب اہل التصوف" میں تصوف کے اسلامی نقطہ نظر کے اصولوں سے بحث کی اور ان پر صوفیاء کا ایمان و عمل بنایا۔ شیخ ابونصر سراج نے "کتاب اللمع" میں تصوف کے بنیادی تصورات اور اصلاح نیت پر بہت زور دیا ہے۔

خصوصیات

اس زور میں تصوف کی اصطلاحات کو مقبول بنانے کی شروعات ہوئی اور تصوف کو شریعت اسلامی کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ صوفیا کے حلقے اور گروہ بنے البتہ اس دور میں تصوف کا فلسفہ مدون نہیں ہوا تھا اور نہ ہی سلسلوں کی باقاعدہ تشکیل ہوئی تھی۔

۲۔ اس دور میں پیش آنے والے مسائل کے حل قرآن وسنت اور قیاس کی روشنی میں مدون ہو رہے تھے۔ اور تمام حیلہ بازی کے آگے اسلامی نظریے پیش ہو رہے تھے کیونکہ لوگ نفس کو دھوکہ دینے کے لیے حیلہ تلاش کرتے تھے۔ اس وقت صوفیاء کرام نے حقیقی مذہب کی روح کو بیدار کیا اور باطن کی اصلاح اور اخلاق کی درستگی کی طرف توجہ کی انھوں نے بتایا کہ جب تک قلب صاف نہ ہوگا انسانی زندگی میں کیف وسرور پیدا نہ ہوگا۔

۳۔ صوفیا کرام نے اپنے قلب کے ذریعہ مرید کے قلب کو اللہ کی طرف متوجہ کرانے کی کوشش کی۔

چوتھا دور

یہ دور پانچویں صدی ہجری کا آخری اور چھٹی و ساتویں صدی ہجری یا گیارہویں صدی عیسوی و بارہویں صدی عیسوی کا دور ہے۔ اس دور کے صوفیاء میں شیخ ابونعیم اصبہانیؒ م ۴۳۵ھ (حلیۃ الاولیاء)، شیخ ابوالقاسم قشیریؒ م ۴۶۵ھ (رسالہ قشیریہ)، شیخ علی ہجویریؒ م ۱۰۷۲ء (کشف المحجوب)، شیخ عبداللہ انصاری م ۴۸۱ھ (منازل السائرین، طبقات الصوفیہ)، شیخ ابوسعید ابی الخیرؒ م ۴۴۵ھ (فارسی رباعیات)، محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ م ۵۶۱ھ (فتوح الغیب، فتح ربانی)، امام غزالی م ۵۰۵ھ (احیاء علوم الدین)، محی الدین ابن العربی م ۶۳۸ھ (فصوص الحکم، فتوحات مکیہ)، شیخ شہاب الدین سہروردیؒ م ۶۳۲ھ (عوارف المعارف) مشہور ہیں۔

خصوصیات

۱۔ اس دور میں تصوف نے باقاعدہ منظّم شکل اختیار کر لی تھی اور ایسے صوفیاء سامنے آئے جنہوں نے تصوف کو سماجی زندگی کے لیے اہم چیز بنا دیا اور اس کی بنیادیں سماج میں گہری ہوگئیں۔ سلسلوں کا رواج شروع ہو کر تمام اسلامی دنیا میں پھیل گیا اور ہر طرف سے علماء نے حمایت کی جن میں شیخ ابونعیم شافعیؒ، شیخ علی ہجویری حنفیؒ اور شیخ عبداللہ انصاری وغیرہ۔

۲۔ اس عہد میں صوفی شعرا نے اپنے اشعار کے ذریعہ صوفیانہ خیالات کی ترویج و اشاعت کی۔

۳۔ اس دور میں تصوف نے ایک باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کر لی اور تصوف و شریعت کی مطابقت سے علماء کا بڑا طبقہ تصوف کی طرف کھنچ آیا۔

۴۔ اس دور میں تصوف کو عوام میں مقبول بنانے کے لیے صوفیاء کرام نے

کتابیں تصنیف کیں۔

بارہویں صدی عیسوی کے بعد تصوف کا فلسفہ مکمل طور پر ترتیب دیا گیا یہاں تک کہ اس کو مستقل فن کی حیثیت حاصل ہوگئی اور بعض روحانی سلسلوں کی داغ بیل بھی پڑی مثلاً قادریہ، سہروردیہ وغیرہ لیکن ان کو عروج تیرہویں صدی عیسوی میں حاصل ہوا۔

اس وقت تقریباً پوری اسلامی دنیا کی حالت نہایت خراب اور افسوس ناک تھی بغداد کی عظمت ختم ہو چکی تھی۔ امراء وسلاطین، خلفاء، وزراء اور عوام سب اخلاقی پستی کے شکار تھے۔ عجم کا سیاسی نظام بیدار ہو چکا تھا۔ اندلس میں طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔ ان حالات میں صوفیاء کرام نے اسلامی معاشرہ کی اصلاح ودرستگی کی کوشش کی اور امراء وعوام دونوں کو اپنی تعلیمات کا مخاطب بنایا تاکہ اخلاقی قدریں بحال ہوں اور اسلامی شریعت رائج ہو۔ امام غزالیؒ نے سلجوقی سلطنت کی اندرونی کشمکش اور سلاطین کے کردار پر نکتہ چینی کر کے ان کو خواب غفلت سے بیدار کیا اور عوام میں جرأت وہمت پیدا کی۔ عبد القادر جیلانیؒ نے خلفاء وقت پر عوام کے مجمع میں تنقید کی۔ شیخ محی الدین ابن العربیؒ، شیخ نجیب الدین سہروردی اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے عوام کی اصلاح اور مسلم حکمرانوں کے غلط کاموں پر تنقید کی۔ صوفی شعراء حکیم صناعی، نظامی، گنجوئی اور خواجہ فرید الدین عطار وغیرہ کے قصیدے، رباعی اور غزل کی وجہ سے تصوف عام ہوا۔ اس کے علاوہ منگولوں کے حملہ کی وجہ سے پھیلی ذہنی ابتری کو دیکھتے ہوئے مشائخ نے روحانی نظام قائم کر کے عوام کی اصلاح وتربیت کی۔

☆☆☆

ہندوستان میں تصوف کا ارتقاء

تیرہویں صدی عیسوی تک تصوف عوامی تحریک بن چکا تھا اور اس وقت تقریباً پوری اسلامی دنیا افراتفری کا شکار تھی۔ اسی عہد میں صوفیاء کرام نے پرسکون اور محفوظ جگہ کی تلاش میں ہندوستان کا رخ کیا۔ یہاں ان کی نہ صرف قدر ہوئی بلکہ سیاسی اور عوامی دونوں سطحوں پر خیر مقدم کیا گیا۔ ان لوگوں نے دور دراز علاقوں میں اپنی خانقاہیں قائم کر کے رفاہ عامہ کا کام شروع کیا۔ ہندوستان میں مشہور سلسلوں میں جنیدیہ، چشتیہ، سہروردیہ، نقشبندیہ، فردوسیہ، قادریہ وغیرہ ہیں۔ لیکن ان میں درج ذیل چار سلسلوں کو سب سے زیادہ فروغ حاصل ہوا۔

۱۔ چشتیہ ۲۔ سہروردیہ ۳۔ قادریہ ۴۔ نقشبندیہ

۱۔ چشتیہ

چشت صوبہ ہرات (افغانستان) میں ایک جگہ کا نام ہے۔ جہاں مشائخ نے روحانی اصلاح و تربیت کا ایک مرکز قائم کیا لہذا اس سلسلے کے بزرگ مقام کی نسبت سے چشتی کہلائے۔ چشتیہ سلسلے کی شروعات خواجہ ابو اسحاق شامی م ۲۹۸ھ نے کی۔ آپ جب خواجہ علوی دینوری کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے فرمایا'' آج سے لوگ

تجھ کو ابو اسحاق چشتی کہہ کر پکاریں گے اور چشت کے لوگ تجھ سے ہدایت پائیں گے"
اس کے بعد انہیں چشت کی طرف روانہ کر دیا۔ جہاں انھوں نے دینی اصلاحی مرکز کی بنیاد رکھی اور چشتی سلسلے کی شروعات کی اس سلسلے کی نسبت حضرت علیؓ سے ملتی ہے۔ ہندوستان میں خواجہ معین الدین چشتیؒ نے ۶۲۷ھ میں اجمیر میں پرتھوی راج چوہان کے عہد میں تبلیغ واشاعت کے ذریعہ اس سلسلے کو فروغ دیا۔ آپ کے بزرگ خلیفہ خواجہ بختیار کاکیؒ نے دہلی میں، بابا فرید گنج شکر نے اجودھن میں اس سلسلے کی اشاعت کی۔ بابا فرید گنج شکر کے خلفاء میں شیخ نظام الدین اولیاء نے چشتیہ نظامیہ، شیخ علی احمد صابر کلیری نے کلیر (رڑکی) میں چشتیہ صابریہ کی اشاعت کی اور آخر میں نصیر الدین چراغ دہلوی نے فیروز شاہ تغلق کے عہد میں دار الخلافہ دہلی میں اپنے ساتھ ان سب کو سمیٹ لیا۔

خصوصیات۔ چشتیہ سلسلے کی اساس ذکر بالجہر (بآواز ذکر) اور نفس کی حفاظت کے ساتھ شیخ سے محبت و تعظیم کے تعلق پر ہے۔ اس کے علاوہ چلہ کشی، روزے کی کثرت، تہجد کی پابندی، گفتگو اور کھانے وسونے میں کمی کرنا اور وضو کی پابندی اس کی بنیادی چیزیں ہیں۔ اس کی شاخ چشتیہ نظامیہ اور چشتیہ صابریہ کے یہاں کلمۂ شہادت پڑھتے وقت لا الہ الا اللہ پر زور دیا جاتا ہے۔ اور سر اور جسم کے بالائی حصہ کو جھٹکا دیتے ہیں۔ موسیقی وسماع ان کی امتیازی خصوصیت ہے جس میں وجدانی کیفیت اس قدر طاری ہو جاتی ہے کہ آدمی تھک کر چور ہو جاتا ہے۔ چشتی درویش عموماً بادامی ہلکے رنگ کے کپڑے پہنتے ہیں۔

۲۔ قادریہ

اس سلسلے کے بانی شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ہیں۔ آپ نے اپنے عہد کے خلفاء کی

بداخلاقی، عوام کے بدتر حالات اور ملک کے سیاسی ماحول کی اصلاح کے لیے تربیت کا ایک نظام شروع کیا اور اپنے وعظ و نصیحت کے ذریعہ امراء اور عوام دونوں کو اخلاقی پستی سے نکالنے کی کوشش کی۔ آپ کی نسبت سے اصلاح و تربیت کا یہ نظام سلسلۂ قادریہ کہلایا۔ آپ نے اپنے خلفاء کو تبلیغ و اشاعت کی غرض سے اطراف ملک روانہ کیا۔ شاہ نعمت اللہ قادری، سید محمد غوث گیلانی، مخدوم عبدالقادر ثانی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے ہندوستان میں مغلیہ عہد میں اس کی اشاعت کی۔

خصوصیات: یہ نوافل کا اہتمام کرتے ہیں اور ہر وقت ذکر کی پابندی پر زور دیتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضری کا احساس رہے اس کے علاوہ۔ سماع بالمزامیر (گانے بجانے کے آلات) کے مخالف ہیں اور ذکر خفی (بغیر آواز) اور جلی (باآواز بلند) دونوں کو جائز سمجھتے ہیں، موسیقی کو بہت کم اہمیت دیتے ہیں بلکہ درود شریف کے ورد پر زور دیتے ہیں۔ پنجاب کے بیشتر صوفی اس سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں اس سلسلے کے بزرگ سبز رنگ کی پگڑی باندھتے ہیں اور لباس کے کسی حصے کو بادامی رنگ کا رکھتے ہیں۔

۳۔ نقشبندیہ

اس سلسلے کے بانی شیخ بہاء الدین محمد نقشبندی بخاری ہیں۔ ان کا مقصد عقائد کی اصلاح، عبادت کی کثرت اور اللہ تعالیٰ سے تعلق کو مضبوط کرنا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ سے قربت کے تین طریقے بتاتے ہیں۔ ۱۔ ذکر ۲۔ مراقبہ ۳۔ ربط شیخ

ذکر سے مراد حبس نفس کے ساتھ نفی و اثبات کا ذکر ہے اور یہ متقدمین کا طریقہ ہے۔ مراقبے سے مراد انسان اپنے تمام ادراک و احساس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جائے بلکہ الفاظ کی جگہ ذات کو مرکز بنائے۔ اور ربط شیخ سے مراد شیخ کے سامنے

حاضری دے کر اس کی محبت اور تصویر میں مگن ہو کر شیخ سے فیض حاصل کرے اور دل سے اس کی اتباع کرے اور غیر حاضری میں بھی شیخ کا تصور رہے۔ اس کی شاخ سلسلۂ باقیہ خواجہ باقی باللہ سلسلۂ مجددیہ شیخ احمد سرہندی سلسلۂ احسنیہ آدم دینوری سے منسوب ہے۔

خصوصیات: یہ ذکر جلی (زور سے ذکر) کے مخالف ہیں اور ذکر خفی (خاموشی) کو جائز سمجھتے ہیں۔ مراقبہ میں سر کو جھکا کر یا زمین پر لگا کر آنکھ بند کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔ موسیقی اور سماع کے سخت مخالف ہیں اور احکام شریعت کے پابند ہوتے ہیں۔ مرشد حلقے میں شریک ہو کر ان کی توجہ باطن کی طرف کرنے میں رہنمائی کرتا ہے۔ بیعت کے وقت مریدوں کا سر تراشا جاتا ہے اور توبہ و استغفار پر زور دیا جاتا ہے تاکہ بیعت کے بعد سے نئی روحانی اور اخلاقی زندگی کا آغاز ہو۔ اس سلسلے کی نسبت حضرت ابوبکرؓ سے ملتی ہے۔

۴۔ سہروردیہ

اس سلسلے کے بانی شیخ شہاب الدین عمر سہروردی ہیں اور ہندوستان میں اس کی بنیاد شیخ شہاب الدین زکریا ملتانی کے ذریعہ پڑی۔ یہ دن و رات کے اوقات کو نظم کے ساتھ مناسب و بہتر کاموں میں لگاتے ہیں مثلاً روزہ و تہجد وغیرہ دعائے ماثورہ وظائف کی پابندی نیز نفی و اثبات کے ذکر میں اس طرح مشغول رہتے کہ دل پر اس کا اثر نہ ہو۔ سانس بند کر کے اللہ کا ورد کرنے کا ان کے یہاں بڑا رواج ہے۔ یہ ذکر جلی و ذکر خفی دونوں کے قائل ہیں سماع کو پسند نہیں کرتے بلکہ تلاوت قرآن پر زور دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ موسیقی اور سماع ان کے یہاں بہت کم ہے غیر مسلموں سے رواداری پر زور دیتے ہیں۔ سیر و تفریح کا شوق اور تبلیغ دین کو پسند کرتے ہیں۔ ادبیات اور شعر و شاعری کا ذوق پایا جاتا ہے۔ اس سلسلے کے صوفیاء میں جلال زیادہ پایا جاتا ہے۔

☆☆☆

حضرت شیخ ابوالحسن علی ہجویری داتا گنج بخشؒ

(۴۰۰ھ-۴۶۵ھ)

نام ونسب: آپ کا نام علی، کنیت علی حسین ہے جگہ کی مناسبت سے ہجوری جلابی اور لاہوری بھی مشہور ہیں۔ آپ کی ولادت غزنی کے ایک گاؤں ہجور میں ۴۰۰ھ میں ہوئی۔ پورا سلسلہ نسب یہ ہے علی بن سید عثمان بن سید علی بن سید عبدالرحمان بن شاہ شجاع بن ابوالحسن علی بن حسن اصغر بن سید زید شہید بن امام حسن بن علی مرتضیٰؓ۔

تعلیم وطریقت: آپ کے اساتذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے ان میں چند مشہور یہ ہیں شیخ ابوالعباس بن محمد، شیخ ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن القریشی، شیخ ابوجعفر محمد بن المصباح الصید لانی، ابوالعباس احمد بن محمد القصاب، ابوعبداللہ محمد بن علی، ابوسعید فضل اللہ بن محمد اور ابواحمد المظفر بن احمد بن ہمدان ہیں۔ باطنی وروحانی تعلیم ابوالفضل محمد بن الحسن ختلی سے حاصل کی آپ جنیدیہ سلسلے سے منسلک تھے۔ اس کے علاوہ روحانی تعلیم کے لیے اسلامی ممالک شام، عراق، بغداد، فارس، آذربائیجان، خراسان، ماوراء النہر و ترکستان وغیرہ کا سفر کیا اور وہاں کے اولیاء وصوفیا کرام سے مستفیض ہوئے۔ خراسان میں شیخ محمد زکی بن العلاء، شیخ القاسم سدوسی، شیخ ابوالحسن ابن سالبہ، شیخ ابوطاہر مکشوف شیخ احمد نجار سمرقندی وغیرہ تقریباً تین سو مشائخ سے ملے اور متاثر ہوئے۔

روحانیت کے لئے یوں تو آپ مخلوق سے بالکل قطع تعلق ہو گئے تھے لیکن بیان کیا جاتا ہے کہ چالیس سال تک مسلسل سفر میں رہے لیکن آپ نے کبھی جماعت کی نماز

ناغہ نہیں کی اور ہر جمعہ کو نماز کے لیے کسی قصبہ میں قیام فرمایا۔ آپ صوفیاء کے ظاہری رسوم سے نفرت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ گناہ اور دکھاوا ہے۔

وفات: آپ کی وفات ۴۶۵ھ میں لاہور میں ہوئی جو ان کی آخری قیام گاہ تھی۔ آپ کے انتقال کے بعد آپ کا مزار عوام کی زیارت گاہ بن گیا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور حضرت بابا فرید الدین گنج شکر نے آپ کی قبر پر چلہ کشی کی تھی جو ان کے اعلیٰ روحانی کمال کی دلیل ہے۔

تصانیف

کشف المحجوب، منہاج الدین، کتاب الفنا وبقا، کتاب البیان لاہل العیان، بحر القلوب، الرعایۃ الحقوق اللہ وغیرہ۔ آپ کو شعر وشاعری کا بھی شوق تھا کشف المحجوب میں اپنے دیوان کا بھی ذکر کیا ہے لیکن آپ کی تصنیفات میں کشف المحجوب کے علاوہ کوئی بھی دستیاب نہیں ہے۔

کشف المحجوب: فارسی زبان میں یہ تصوف کی پہلی کتاب ہے اس کی اہمیت کا اندازہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے اس قول سے لگایا جا سکتا ہے کہ جس کا کوئی مرشد نہ ہو اس کو کشف المحجوب کے مطالعہ کی برکت سے مل جائے گا۔ اس میں حضرت شیخ ہجویریؒ نے تصوف کے تمام پہلو پر روشنی ڈالی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ پہلی مرتبہ اسلامی تصوف کو ہندوستان میں پیش کیا گیا۔ آپ نے اس کتاب میں مختلف ابواب اور فصلوں کے تحت تصوف، اس کی اصطلاحات اور تعلیمات مثلاً علم، فقر، صوفی کی اصلیت، تصوف، مجاہدہ و ریاضت، فنا و بقا، معرفت، مشاہدہ اور سماع وغیرہ کو واضح کیا ہے۔

تعلیمات: آپ نے علم حقیقت (خدا کا علم) اور علم شریعت کو ضروری قرار دیا ہے۔ ایک فقیر رضاء الٰہی کی خاطر دنیا کی تمام چیزوں کو نظر انداز کر دیتا ہے یہ فقر کمال ہے جب کہ غنا خدا کی صفت ہے جو اسی بندہ کو ملتی ہے جس کو خدا چاہے۔ صوفی وہ ہے

جس کے اخلاق و آداب اچھے، طبیعت پاک وصاف اور قلب آلودہ نہ ہو۔ اور وہ اپنے نفس پر تکلیف اٹھاتا ہو۔ تصوف کی بنیاد آٹھ خصلتوں پر ہے جن سے آٹھ پیغمبروں کی پیروی ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی سخاوت، حضرت اسماعیلؑ کی رضا، حضرت ایوبؑ کا صبر، حضرت زکریاؑ کے ارشادات، حضرت یحییٰؑ کی غربت، حضرت عیسیٰؑ کی سیاحت، حضرت موسیٰؑ کا لباس اور حضور اکرم ﷺ کا فقر۔

''صوفی کا لباس سنت رسول ﷺ کی پیروی کرتے ہوئے کمبل یا گدڑی ہونا چاہئے جو فقر اور ریاضت کی دلیل ہے۔ جنید بغدادیؒ کے اس قول کی تائید شیخ ہجویری نے بھی کی ہے۔ صوفیاء دنیا اور عوام سے دور رہنے کے لیے ملامت پسند کرتے ہیں تاکہ معاملات و عبادات درست ہوں۔ دنیا کی عیش پرستی سے دور ہوں اور ضلالت و گمراہی سے بچ سکیں۔ آپ خدا کے بندہ سے راضی ہونا اور بندہ کا خدا سے راضی ہونا دونوں ہی کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک سکر حق تعالی کی محبت کا غلبہ ہے جس کی وجہ سے انسان کے ہوش باقی نہیں رہتے اور فنا کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے سحو کسی چیز میں کھو جانے کے بعد اس کو حاصل کر لینے کا نام ہے اور اس میں خدا کے دیدار سے حیرت اور وحشت باقی نہیں رہتی۔ نفس اور ریاضت کا نام مجاہدہ ہے۔ جس کا مقصد خواہشات کی مخالفت کرنا اور یہ جہاد اکبر ہے۔ اللہ کچھ ایسے بندوں کو اپنا دوست بناتا ہے جو دنیاوی عیش و آرام چھوڑ کر اللہ سے محبت کرتے ہیں جب دوسرے لوگ ڈرتے ہیں تو یہ نہیں ڈرتے اور دوسرے غمگین ہوتے ہیں تو یہ غمگین نہیں ہوتے ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے یہ دنیا قایم ہے۔ جب ولی اپنی ولایت میں سچا ہوتا ہے تو کرامات ظاہر ہوتی ہیں جو اللہ تعالی اپنے ان نیک بندوں کو بخشتا ہے۔ آپ فنا اور بقا دونوں کی تردید کرتے ہیں البتہ سماع کو جائز قرار دیتے ہیں نیز اس میں رقص و سرور حرام و ناجائز ہے۔

☆☆☆

حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ

(۵۳۲ھ-۶۳۲ھ)

نام و نسب: ہندوستان میں سلسلۂ چشتیہ کے بانی خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کا لقب قطب المشائخ، ملک المشائخ، سلطان السالکین، منہاج المتقین، قطب الاولیا، شمس الفقراء، حجۃ الاولیا وغیرہ ہیں آپ کا سلسلہ نسب یہ ہے معین الحق بن غیاث الدین بن سید کمال الدین بن سید احمد حسین بن سید طاہر بن سید عبد العزیز بن ابراہیم بن محمد محمدی بن امام حسن عسکری بن امام نقی بن امام تقی بن امام موسیٰ رضا بن امام جعفر بن محمد باقر بن امام علی زین العابدین بن امام حسین بن علی مرتضیٰؓ۔ آپ ۵۳۲ھ بجستان میں پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم: بارہ سال کی عمر میں والد محترم کا انتقال ہو گیا۔ وراثت میں ایک باغ ملا جس کی نگہبانی کیا کرتے تھے۔ ایک روز وہاں ایک بزرگ ابراہیم قلندر آئے۔ خواجہ معین الدین نے ان کی خدمت میں انگور پیش کئے۔ انہوں نے کھلی کے ایک ٹکڑے کو دانتوں سے چبا کر خواجہ صاحب کو کھلا دیا۔ آپ دنیا کی چیزوں کو چھوڑ کر خدا کی راہ میں نکل پڑے اور سمر قند پہونچے۔ وہاں قرآن شریف حفظ کیا پھر تعلیم میں مشغول ہو گئے۔ سمر قند سے نکل کر عراق کی طرف گئے وہاں کے قصبہ ہارون میں حضرت شیخ عثمان ہارونی کے ہاتھ پر بیعت کی جو چشت کے رہنے والے تھے اسی لیے چشتی کہلائے۔ بیس سال تک خواجہ معین الدین ان کی خدمت میں رہے اس کے بعد اپنے

مرشد کے ساتھ خواجہ بہاء الدین اوشی سے ملاقات کی اور ان کے ساتھ حجاز کا سفر کیا۔ مدینہ منورہ میں ہی ہندوستان جانے کی بشارت ملی، اس لیے پیر سے خلافت حاصل کر کے بغداد آئے۔ سنجان میں شیخ نجم الدین کبری کی خدمت میں ڈھائی سال رہے، اس کے بعد شیخ عبدالقادر جیلانی سے ملاقات کی جہاں شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ ضیاء الدین اور خواجہ اوحد الدین کرمانی سے فیضیاب ہوئے۔ بغداد سے ہمدان آئے جہاں خواجہ یوسف ہمدانی اور تبریز میں ابوسعید تبریزی سے ملاقات کی۔ اصفہان میں شیخ محمود اصفہانی، استر آباد میں شیخ ناصر الدین استر آبادی سے ملاقات کی، اس کے بعد بلخ اور غزنی ہوتے ہوئے ہندوستان آ گئے۔ لاہور میں شیخ علی ہجویری کے مزار پر چلہ کیا، اس کے بعد ملتان آئے، وہاں پانچ سال رہ کر ہندوستان کی زبانیں (سنسکرت، پراکرت) سیکھی۔ اس کے بعد دلی ہوتے ہوئے ۵۶۱ھ میں اجمیر پہنچے اور یہیں مستقل قیام فرمایا۔ یہ پرتھوی راج چوہان کا دور تھا جو ان کے خلاف صف آرا ہوا اور ہندو جوگی جے پال کو جادو کے ذریعے مغلوب کرنے کے لیے بھیجا، وہ ان کی روحانیت کا قائل ہو کر مسلمان ہو گیا۔ خواجہ نے اس کا نام عبداللہ رکھ کر اس کو خلافت عطا فرمائی۔ خواجہ صاحب کی بڑھتی مقبولیت کو دیکھ کر پرتھوی راج نے ان کو اجمیر سے نکالنے کی دھمکی دی، لیکن ان کی پیشین گوئی کے مطابق سلطان شہاب الدین غوری نے ۵۸۸ھ میں حملہ کر کے اس کا خاتمہ کر دیا۔ شہاب الدین غوری کی فتح کے بعد مسلمانوں کے سیاسی اقتدار اور خواجہ صاحب کی کوششوں اور برکتوں سے ہندوستان میں اسلام تیزی سے پھیلا۔

خاندان: خواجہ صاحب نے اجمیر میں دو شادیاں کیں۔ ایک حاکم اجمیر سید وجیہ الدین مشہدی کی بیٹی عصمت اللہ بی بی سے، دوسری کسی ہندو راجہ کی بیٹی امۃ اللہ (نومسلمہ) سے۔ آپ کے تین بیٹے سید ضیاء الدین، ابوسعید، سید فخر الدین اور سید حسام

الدین اور ایک بیٹی بی بی حافظہ جمال تھیں۔ خواجہ صاحب نے سید فخر الدین اور بی بی حافظہ جمال کو خلافت بھی دی تھی اور یہ عورتوں کو شرعی و روحانی تعلیم دیا کرتی تھیں۔

وفات: دوشنبہ (پیر) کے دن ٦ رجب ٦٣٢ھ میں تقریباً ١٠٠ سال کی عمر میں وفات پائی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وفات کے دن عشاء کی نماز پڑھ کر اپنے حجرہ کا دروازہ بند کرلیا۔ اندر سے ایسی آوازیں آتی رہیں جیسے کہ وجد کی حالت میں پاؤں پٹک رہے ہیں۔ آخری شب میں آواز بند ہوگئی فجر کے وقت دروازہ کھولا گیا تو آپ کا انتقال ہو چکا تھا۔

اخلاق و کردار: خواجہ صاحب خوف الٰہی کے ساتھ عشقِ رسول اللہ ﷺ کے نشے میں سرشار رہتے اور اکثر حدیث نبوی بیان فرما کر رونے لگتے۔ تقریباً پوری رات عبادت میں مشغول رہتے۔ عام طور سے عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھتے اور دن و رات میں دو بار قرآن مجید ختم کرتے۔ آپ کی طبیعت میں عفوودرگذر کی خوبی اپنی انتہا کو پہونچی ہوئی تھی۔ آپ کو اپنے خلفاء اور مریدوں سے بہت زیادہ محبت تھی خانہ کعبہ میں چشتیہ سلسلے کے قیامت تک رہنے کی دعا کی۔

فقروفاقہ کے باوجود خانقاہ میں اتنا کھانا پکتا کہ تمام غرباء و مساکین خوب پیٹ بھر کھاتے، پڑوسیوں کے حقوق کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اور اگر کسی پڑوسی کا انتقال ہو جاتا تو جنازہ کے ساتھ ضرور جاتے اور لوگوں کے واپس آنے کے بعد تک دعا کرتے رہتے۔ سماع کا آپ کو بہت شوق تھا اور محفل سماع میں ان پر غیر معمولی کیفیت طاری ہو جاتی۔

ملفوظات: آپ کی کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے البتہ آپ کے نام سے منسوب کئی تصنیفات کا ذکر ملتا ہے مثلاً رسالہ در کسب نفس، رسالہ وجودیہ، حدیث المعارف، گنج

الاسرار، دیوان معین وغیرہ۔

تعلیمات: آپؒ والدین کی خدمت، کلام اللہ کی تلاوت، علماء ومشائخ کی عزت، خانہ کعبہ کی زیارت اور پیر کی خدمت کو اہل سلوک کی عبادت شمار کرتے۔ قبرستان کی تعظیم نہ کرنے کو گناہ کبیرہ قرار دیتے۔ راہ سلوک میں چودہ مقامات کا ذکر کر کے ان کو انبیاء سے منسوب کرتے ہیں۔ توبہ حضرت آدمؑ، عبادات حضرت ادریسؑ، زہد عیسیٰؑ، رضا ایوبؑ، قناعت یعقوبؑ، مجاہدہ یونسؑ، صدق وسچائی یوسفؑ، غور وفکر شعیبؑ، استرشاد (رہنمائی حاصل کرنا) شیث علیہ السلام، اصلاح داؤدؑ، اخلاص نوحؑ، معرفت خضرؑ، شکر ابراہیمؑ اور محبت حضور اکرم ﷺ کے ساتھ مخصوص کرتے۔

ان کے نزدیک نماز اور شریعت کی تعلیمات کا انکار کرنے والا کافر ہے، صدقہ دینا ہزار رکعت نفل نماز پڑھنے سے بہتر ہے، مومن کو گالی دینا گناہ کبیرہ ہے، ضرورت مندوں کی مدد کرنے والا اللہ کا دوست ہے تین لوگ جنت کی بو تک نہ پائیں گے ایک جھوٹ بولنے والا درویش، کنجوس، خیانت کرنے والا سوداگر۔ مرید کو شریعت کا پابند ہونا چاہئے۔ نماز دین کا ستون ہے جب وہ نماز پڑھے اس طرح گویا کہ وہ خدا کو دیکھ رہا ہے۔

خلفاء: قطب الدین بختیار کاکی (دلی)، خواجہ فخر الدین، شیخ حمید الدین ناگوری، جے پال جوگی (عبداللہ اجمیری) شیخ صدر الدین کرمانی، بی بی حافظہ جمال، شیخ علی سنجری، شیخ سعود غازی وغیرہ خلفاء کا ذکر ملتا ہے جو ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اس لیے بھیجے گئے تھے کہ وہ اسلام کی سچی عظمت اور شان وشوکت کو قائم کریں۔

☆☆☆

حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی سہروردیؒ

(۵۶۵ھ-۶۶۵ھ)

ولادت و خاندان: آپ کی پیدائش ۵۶۵ھ میں ملتان میں ہوئی۔ آپ کے بزرگ کمال الدین علی شاہ قبیلہ قریش سے تعلق رکھتے تھے جو مکہ معظمہ سے خوارزم آئے اور وہاں سے آ کر ملتان میں سکونت فرمائی۔ سہرورد عراق میں ہمدان اور زنجان کے درمیان ایک مقام ہے۔ ان کے پیر اسی علاقے کے رہنے والے تھے اسی نسبت سے سہروردی کہلائے۔

ابتدائی تعلیم: بارہ سال کی عمر میں والد کے انتقال کے بعد کلام پاک ساتوں قرأتوں کے ساتھ حفظ کرنے کے بعد خراسان میں سات سال تک بزرگان دین سے علوم ظاہر و باطنی کی تعلیم حاصل کی وہاں سے بخارا جا کر علم میں مہارت حاصل کی پھر حج کے ارادہ سے مکہ معظّمہ گئے اور مدینہ میں پانچ سال تک مولانا کمال الدین محمد سے حدیث پڑھی۔ دل کی پاکیزگی، صفائی اور روح کے اطمینان کے لیے یہاں پر مجاہدہ بھی کیا۔ وہاں سے بیت المقدس ہوتے ہوئے بغداد تشریف لے گئے۔ بغداد میں شہاب الدین سہروردی کی صحبت سے فیضیاب ہو کر ستر دن کی قلیل مدت میں ہی خرق خلافت حاصل کر لیا۔ اور شیخ کے حکم سے ملتان کا رخ کیا۔ جلال الدین تبریزی کے ساتھ نیشاپور میں اور شیخ فرید الدین عطار کی خدمت میں حاضر ہونے کے بعد ملتان آ گئے اور یہاں پر

عوام وخواص کے لیے رشد وہدایت کا سلسلہ شروع کیا اور لوگ آپ کے فیض و برکات سے مستفیض ہوئے۔

قیام ملتان: اس وقت ملتان کا حکمراں ناصر الدین قباچہ سلطان شمس الدین التمش کا دشمن تھا۔ التمش دینداری اور پابندیٔ شریعت کی وجہ سے اولیاء اللہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے شیخ بہاء الدین زکریا کا قلبی رجحان التمش کی طرف تھا۔ جس کی وجہ سے ناصر الدین نے سلطان التمش کے خلاف سازش کی جسے ملتان کے قاضی مولانا شرف الدین اصفہانی اور خود شیخ بہاء الدین زکریا نے ناپسند کیا اور سلطان کو خطوط لکھ کر ناصر الدین کی دشمنی سے مطلع کیا مگر خطوط قباچہ کے آدمیوں کے ہاتھ لگ گئے اس نے دونوں بزرگوں کو طلب کر کے بہاؤ الدین زکریا کو اپنی داہنی جانب بیٹھایا اور قاضی شرف الدین اصفہانی کو اپنے سامنے بٹھا کر خط ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ شرف الدین اصفہانی نے خط پڑھ کر خاموشی اختیار کی جس کی وجہ سے قباچہ نے ان کو قتل کرا دیا۔ لیکن شیخ بہاؤ الدین زکریا نے اپنا خط دیکھ کر فرمایا کہ بیشک یہ میرا خط ہے اور میں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے لکھا ہے یہ سن کر اس پر لرزہ طاری ہو گیا اور اس نے معذرت کر کے اعزاز واحترام کے ساتھ رخصت کر دیا۔

اخلاق وعادات: آپ بہت فیاض تھے مطبخ میں طرح طرح کے کھانے پکتے تھے لیکن ان کو اس کھانے میں اس وقت مزہ آتا جب مہمان مسافر اور درویش ان کے ہمراہ ہوتے۔ آپ کو کبھی دولت کی کمی محسوس نہ ہوئی لیکن وہ ہمیشہ بے نیاز رہے اور اپنی دولت کو ضرورت مندوں میں تقسیم کرا دیتے تھے۔ مزاج میں حلم و بردباری بہت تھی دوسروں کا احترام کرتے۔ آپ سماع سے بھی کبھی کبھی شوق فرماتے اور ان پر وجد طاری

ہو جاتا۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک قوال کو بلایا عشاء کے بعد دو پارے تلاوت کئے حجرہ کی زنجیر لگادی اور اس کے بعد قوالی شروع ہوئی تو وجد میں کھڑے ہو کر چراغ بجھا دیا تا کہ کسی کو کیفیت معلوم نہ ہو سکے اس کے بعد حجرہ سے باہر تشریف لے گئے۔ سب سے زیادہ کلام پاک کی تلاوت پسند کرتے ان کا معمول تھا کہ تہجد کی نماز کے بعد کلام پاک شروع کرتے اور فجر کی نماز کی سنتوں تک جاری رکھتے۔

وفات: آپ کی وفات تقریباً ۶۶۵ھ ملتان میں ہوئی اور وہیں مدفون ہوئے۔ وفات کے متعلق ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس روز اپنے حجرہ میں عبادت کر رہے تھے کہ حجرہ کے باہر مقدس بزرگ نے آپ کے صاحبزادے شیخ صدرالدین کے ہاتھ میں ایک خط دیا ان کو عنوان دیکھ کر بہت تعجب ہوا۔ والد صاحب کو خط دے کر واپس آئے تو بزرگ غائب تھے خط پڑھتے ہی والد کی آواز نکلی یہ دوڑ کر حجرہ میں گئے تو والد صاحب کی روح پرواز کر چکی تھی۔ اسی وقت اجودھن میں حضرت بابا گنج شکر بے ہوش ہو گئے۔ ہوش میں آئے تو مریدوں کے ساتھ غائبانہ نماز جنازہ ادا کی۔

تعلیمات: آپ کی کسی تصنیف یا ملفوظات کا پتہ نہیں ہے لیکن اپنے مریدوں کو آپ نے جو وصیت اور خطوط لکھے تھے ان سے آپ کی تعلیمات کا پتہ چلتا ہے۔

اخلاص: بندہ پر واجب ہے کہ سچائی اور اخلاص سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے تا کہ غیر اللہ کی نفی ہو اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے احوال کو درست کرے۔ اور اپنے اقوال و افعال میں اپنے نفس کا جائزہ لے بلاوجہ نہ کوئی بات کہے اور نہ کوئی کام انجام دے۔ ہر قول و فعل سے پہلے اللہ تعالیٰ کے سامنے روئے اور اس سے نیک عمل کی توفیق کی مدد چاہے۔

ذکر: اللہ تعالی کے ذکر کو لازم رکھو کیونکہ ذکر ہی سے محبت کی طلب پیدا ہوتی ہے اور جب محبت مل جاتی ہے تو تمام گندگی و برائی ختم ہو جاتی ہے۔ اور یہ ذکر و محبت اللہ تعالی کے لیے ہی خاص ہو۔ مرید کو اپنے روزگار کی حفاظت کرنا چاہیے اور دل سے اللہ تعالی کے علاوہ ہر چیز کو بھلا دے اور لوگوں کی صحبت سے بچے تا کہ اللہ کی یاد میں مشغول رہ سکے۔

مریدوں سے فرمایا کہ جسم کی سلامتی کم کھانے میں، روح کی سلامتی گناہوں سے بچنے میں اور دین کی سلامتی حضور اکرم ﷺ پر درود بھیجنے میں ہے۔

خلفاء: آپ کے مشہور خلفاء میں شیخ حسن افغان، شیخ فخر الدین عراقی، شیخ امیر حسینی، شیخ جمال خندان اور شیخ نجیب برغش بہت مشہور ہیں۔

☆☆☆

حضرت نظام الدین اولیاؒ

(۶۳۴ھ-۷۲۵ھ)

نام ونسب: آپ کا نام محمد اور القاب محبوب الٰہی، سلطان المشائخ، سلطان الاولیا، سلطان السلاطین، اور نظام الدین اولیاءؒ ہیں۔ آپ کا سلسلہ نسب سید محمد بن احمد بن علی بن عبداللہ خلمی بن حسن خلمی بن علی مشہدی بن احمد مشہدی بن ابی عبداللہ بن علی اصغر بن جعفر ثانی بن امام علی ہادی بن محمد تقی بن علی رضا بن موسی کاظم بن جعفر صادق بن محمد باقر بن علی زین العابدین بن امام حسین بن حضرت علی مرتضیٰؓ۔ آپ کا خاندان بخارا سے ہجرت کر کے لاہور آیا اور وہاں سے بدایوں میں سکونت پذیر ہوا جہاں ۶۳۴ھ میں آپ کی پیدائش ہوئی۔

ابتدائی تعلیم: آپ کے والد کا انتقال پانچ سال کی عمر میں ہوا۔ آپ کی والدہ بڑی عبادت گزار اور پرہیزگار تھیں ان کے زیر تربیت بدایوں میں آپ کی پرورش ہوئی۔ آپ کی ابتدائی تعلیم بدایوں میں ہوئی یہیں مولانا علاؤالدین اصولی سے قدوری پڑھی۔ دستار فضیلت کے جلسہ مین علماء ومشائخ شریک ہوئے اور بعض بزرگوں نے پیشین گوئی کی کہ اس لڑکے کا سر کسی کے آگے نہ جھکے گا۔ مزید تعلیم کے لیے دہلی آکر مولانا شمس الدین دامغانی سے استفادہ کیا۔ بلبن ان کا بے حد قدردان تھا چنانچہ اس نے آپ کو شمس الملک کا خطاب دیا تھا۔

شیخ نظام الدین نے مولانا سے حریری کے چالیس مقامات پڑھے۔ مولانا کمال الدین زاہد سے مشارق الانوار کا درس لیا۔ اور حدیث بھی پڑھی۔ بابا گنج شکر سے عوارف المعارف اور تمہید ابوشکور سالمی پڑھی اور انھیں کے ہاتھ پر بیعت بھی کی۔ تقریباً دو سال تک آپ کی صحبت میں رہے۔ اس کے بعد دہلی واپس تشریف لانے لگے تو مرشد نے دو باتوں کی نصیحت فرمائی کہ اگر کسی سے قرض لینا تو جلد ادا کرنے کی کوشش کرنا اور اپنے دشمنوں کو ہمیشہ خوش رکھنا۔ ایک بار مرشد سے ملنے اجودھن گئے تو اپنے محبوب مرید کے لیے اللہ تعالی سے دعا کی کہ الٰہی نظام الدین جو تجھ سے مانگے اس کو عطا کرنا یہ دعا قبول ہوئی اسی لیے وہ محبوب الٰہی کہلائے۔ آخری بار فرمایا ''اللہ تجھے نیک بخت بنائے تم ایسے درخت ہوگے جس کے سائے میں مخلوق آرام پائے گی اور نصیحت حاصل کرنے کے لیے برابر مجاہدہ کرتے رہنا''۔ بابا گنج شکر کی وفات کے وقت آپ اجودھن میں موجود نہ تھے لیکن مرشد نے عصا اور خرقہ جو قطب الدین بختیار کاکی سے ملا تھا مولانا بدرالدین اسحاق کے ذریعہ ان کے پاس دہلی بھیج دیا۔

اخلاق و کردار: خواجہ نظام الدین کی زندگی بڑی تنگدستی میں گزری جب گھر میں کھانے کی کوئی چیز نہ ہوتی تو ان کی والدہ کہا کرتیں کہ آج ہم لوگ خداوند تعالی کے مہمان ہیں آپ کو اس جملے سے بڑی لذت ملتی۔ سلطان جلال الدین خلجی نے آپ کو کچھ گاؤں نذر کرنے چاہے جن کو آپ نے قبول نہ کیا۔ لیکن بعد میں آپ کی تنگدستی جاتی رہی۔

سلطان معز الدین کیقباد نے غیاث پور میں کیلوکھیڑی کے پاس ایک محل بنوا کر شہر آباد کیا جس میں ایک مسجد بھی بنوائی لوگوں کے ہجوم سے آپ کی طبیعت گھبرانے لگی تو کسی دوسری جگہ جانے کا ارادہ کیا لیکن ایک نوجوان کی گزارش پر غیاث پور میں ہی مقیم

رہے۔ بابا گنج شکر کی نصیحت اور ہدایت پر برابر عمل کرتے اور مجاہدہ میں مشغول رہتے۔ اور تقریباً تیس سال تک بڑے سخت مجاہدہ کیۓ دن رات میں ۴۰۰ سے ۵۰۰ رکعت نماز پڑھتے اور تمام عمر روزہ رکھا۔ نماز با جماعت کا ہمیشہ خیال رکھتے۔ نماز فجر، اشراق چاشت کے بعد رشد و ہدایت کی محفل ہوتی جس میں علماء، صلحاء اور صوفیا جمع ہوتے اس دوران غرباء و مساکین کو غلہ اور پیسہ تحفے میں دیا جاتا۔ نماز ظہر سے پہلے قیلولہ کرتے۔ نماز کے بعد مسجد میں علمی نکات بیان کرتے۔ حدیث، کشاف اور دوسری مشہور کتابوں کا درس بھی ہوتا۔ عصر کی نماز کے بعد آپ حجرہ میں تشریف لے جاتے اور مغرب کے وقت باہر آ کر افطار فرماتے۔ مغرب کی نماز کے بعد ایک مجلس ہوتی اور حاضرین کو کھانے کی لذیذ چیزیں پیش کی جاتیں۔ عشاء کی نماز کے لیے پھر باہر آتے اس کے بعد حجرے میں چلے جاتے۔ اس وقت ان کے محبوب شاگرد صرف امیر خسرو آتے اور کچھ حکایتیں سناتے۔ ان کے جانے کے بعد آپ حجرہ میں عبادت و ریاضت میں مشغول ہو جاتے صبح ہونے سے پہلے سحری کھاتے اور صبح جب باہر آتے تو آنکھیں خمار آلود اور سرخ ہوتیں۔ مگر خالق کے ساتھ اتنی مشغولیت کے باوجود اس کی مخلوق کا بھی خیال رکھتے۔ غرباء و مساکین اور فقراء و مسافر کو کبھی خالی ہاتھ نہ جانے دیتے خود بہت کم کھاتے زیادہ تر غرباء میں تقسیم کرا دیتے۔ اس سخاوت و فیاضی کے باوجود قناعت کا یہ عالم تھا کہ اگر بادشاہوں اور شہزادوں میں سے کوئی تحفہ یا ہدیہ پیش کرتا تو فرماتے کہ یہ لوگ درویش کو تباہ کر رہے ہیں۔ اگر کوئی شخص آپ کو برا بھلا کہتا تو آپ اس کو معاف کر دیتے اور کوئی جواب نہ دیتے اگر کوئی مخالف بیمار ہوتا تو اس کی عیادت کے لیے جاتے کیونکہ آپ خدا کی کسی مخلوق سے دشمنی رکھنا طریقت کے خلاف سمجھتے تھے۔ آپ اپنے مریدوں پر بے حد شفقت فرماتے خاص کر امیر خسرو سے آپ کو گہرا لگاؤ تھا مگر محبت کے ساتھ مریدوں کی تربیت میں رعایت نہیں کرتے۔ آپ ہمیشہ درویشانہ لباس پہنتے تھے اور سادگی پسند

کرتے تھے۔

وفات: حضور اکرم ﷺ سے محبت کا یہ عالم تھا کہ وصال سے کچھ دن پہلے خواب میں دیکھا کہ آپ ﷺ فرما رہے ہیں کہ "نظام! تم سے ملنے کا بڑا اشتیاق ہے۔" اس خواب کے بعد سفر آخرت کے لیے بے چین رہتے۔ وفات سے چالیس دن پہلے کھانا پینا بالکل چھوڑ دیا تھا اور برابر روتے رہتے۔ مرض الموت کی شدت میں بھی آپ نے دوا پینے سے منع کر دیا۔ وصال کے روز لنگر خانہ کی تمام چیزیں غریبوں میں تقسیم کر دیں، تا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں کسی چیز کا جواب نہ دینا پڑے۔ وفات سے کچھ پہلے خلفاء کو چیزیں عطا کیں اور مختلف مقامات پر جانے کا حکم دیا۔ اس کے بعد صبح کی نماز پڑھی اور ۱۸/ربیع الاوّل بدھ کے روز ۷۲۵ھ آپ کی وفات ہوئی اور دہلی میں مدفون ہوئے۔ سلطان محمد بن تغلق نے روضۂ مبارک کی عمارت تعمیر کرائی۔

ملفوظات: آپ کے ملفوظات درج ذیل ہیں:

۱۔ فوائد الفواد ۲۔ فضل الفوائد ۳۔ راحت المحبین ۴۔ سیرۃ الاولیاء

تعلیمات: آپ کی تعلیمات میں ایک مرید کو توبہ کے بعد گناہ سے بچنا، ایمان، نماز میں خشوع وخضوع، تلاوت قرآن، وظائف، فقر وفاقہ، ترک دنیا، فرمانبرداری، مجاہدہ، صبر و رضا، توکّل، پیر کا احترام، حلم و بردباری اور سخاوت و فیاضی وغیرہ کی وہی تعلیمات دی گئی ہیں جو چشتیہ سلسلہ کے پہلے بزرگوں نے دی تھیں۔ کچھ مزید تعلیمات درج ذیل ہیں:

جب تک اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں پیدا نہیں ہوتی گناہ ہوتے رہیں گے۔ اس راہ میں صبر و رضا و توکّل ضروری چیزیں ہیں۔ مصیبت و پریشانی کے وقت شکایت نہ کرنا صبر ہے اور ایسے وقت میں اپنی کراہت کا اظہار کرنا رضا ہے۔ توکّل کی تین قسمیں ہیں: ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے حال کا عالم سمجھ کر سوال کرنا۔ دوسرا بندہ کا تعلق بچوں جیسا ہو۔ تیسرا اس کے ہر ہر لمحے کا مالک اللہ تعالیٰ ہے اور یہ اعلیٰ درجہ ہے۔ اس وقت ایمان مکمل

ہوتا ہے جس وقت وہ دنیا کی چیزوں کو کم تر سمجھے اور خدا کے سوا کسی اور پر اعتماد نہ کرتا ہو۔ وہ تنہائی میں خدا کو یاد کرے تا کہ اپنی خواہشات پر قابو پا سکے، ہمیشہ باوضو رہے، روزے رکھے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم کھائے۔ شیخ سے دلی لگاؤ ہو۔ حق کی خاطر ساری چیزوں کو ٹھکرا دے۔ مرید کو چاہیئے کہ دنیا (مالداروں کی دوستی)، اللہ کے علاوہ کسی اور کا ذکر و فکر دل میں کسی قسم کی محبت نہ ہو جب کسی چیز سے توبہ کرے تو اس کی نیت صاف ہو ہر حال میں اس پر جم جائے، کم کھانے، بولنے، سونے اور میل جول رکھنے سے انسان کے اندر کمال پیدا ہوتا ہے۔ اللہ کے بندوں کا خیال رکھے کیونکہ مومن کے دل کو ستانا اللہ کو تکلیف پہونچانا ہے۔ شریعت کی پابندی ہر حال میں ضروری ہے مشائخ وہ لوگ ہیں جن کے ظاہر و باطن دونوں اچھے ہوں۔

سماع: چشتیہ سلسلے میں سماع جائز ہے آپ نے فرمایا کہ ''سماع ایک طرح سے مناسب ہے اس لیے حرام نہیں اس سے دل میں حرارت پیدا ہوتی اگر یہ تحریک یاد حق کے لیے ہے تو جائز ہے لیکن فساد کی طرف مائل کرے تو حرام ہے'' سماع کے لیے یہ ضروری ہے کہ سنانے والا لڑکا اور عورت نہ ہو، جو چیز سنی جائے وہ فحش اور غلط نہ ہو، جو سنے وہ صرف خدا کے لیے سنے، گانے کے آلات استعمال نہ کیے جائیں اور محفل میں عورتیں نہ ہوں۔

خلفاء: آپ کے مشہور خلفاء میں شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی، حضرت امیر خسرو، شیخ قطب الدین منور، شیخ حسام الدین ملتانی، شیخ حسام الدین سوختہ، شیخ شرف الدین شاہ قلندر وغیرہ ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ

(۹۷۱ھ-۱۰۳۴ھ)

نام ونسب: آپ کا نام احمد، لقب بدر الدین اور کنیت ابو البرکات ہے آپ قیوم الزمان خزینۃ الرحمت اور مجدد الف ثانی کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ آپ ۱۴ر شوال ۹۷۱ھ کو سرہند میں پیدا ہوئے۔ آپ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ کی اولاد میں سے تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب کابل کے ایک ممتاز خاندان سے ملتا ہے اس خاندان کے ایک بزرگ امام رفیع الدین کابل سے ہندوستان آکر سرہند میں آباد ہو گئے تھے۔ آپ کے والد عبدالاحد شیخ عبد القدوس گنگوہی سے بیعت تھے۔ اس وجہ سے چشتیہ قادریہ اور سہروردیہ کی خلافت شیخ رکن الدین سے حاصل کی۔ آپ کی ولادت کے بارے میں بزرگوں نے پیشین گوئی کی کہ آپ کے والد نے حضور اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھا کہ آپ نے بچے کے کان میں آذان دی۔ شیخ عبد القدوس گنگوہی کے خلیفہ شیخ عبدالعزیز نے سرہند میں فرشتوں کو دیکھا کہ وہ ان کے فضائل بیان کرنے میں مشغول ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ ہر ہزار سال کے بعد دین کے چہرہ پر آئے گرد وغبار کو صاف کرنے کے لیے ایک مصلح پیدا کرتا ہے جو اصلاح اور اشاعت دین کا کام کرتا ہے'' آپ کی پیدائش حضور اکرم ﷺ کے تقریباً ایک ہزار سال بعد

اس وقت ہوئی جب بدعات عام تھیں اور دین کا مذاق اڑایا جارہا تھا۔ آپ نے ان حالات میں دین میں نئی روح پیدا کردی اس لیے آپ کو مجدد الف ثانی کے نام سے جانا جاتا ہے۔

تعلیم: آپ نے ابتدائی تعلیم والد مخدوم الاحد اور سرہند کے دوسرے علماء سے حاصل کی۔ بہت کم عمر میں قرآن حفظ کرلیا۔ اس کے بعد سیالکوٹ میں علامہ کمال الدین کشمیری سے اس وقت رائج نصاب کی تعلیم حاصل کی۔ شیخ یعقوب صرفی کشمیری سے حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ قاضی بہلول بدخشانیؒ سے تفسیر واحدی تفسیر بیضاوی، صحیح بخاری، مشکوٰۃ اور ترمذی وغیرہ کا درس لیا۔ سترہ سال کی عمر میں آپ نے حدیث، علم فقہ، تفسیر علوم ظاہری اور باطنی کی تعلیم مکمل کرلی اور اپنے والد سے چشتیہ اور قادریہ سلسلہ کا تعلق قائم کرلیا۔ ۱۰۰۷ھ میں آپ کے والد کا انتقال ہوگیا مجدد الف ثانی کی عادات بچپن سے ہی غیر معمولی تھیں جسم یا کپڑا کبھی ناپاک نہ ہوتا۔ بچپن میں بھی کسی نے برہنہ نہیں دیکھا۔ قادریہ سلسلہ کے بزرگ شاہ کمال کیتھلی نے منہ میں زبان دی تو اس کو چوسنا شروع کردیا، تو انھوں نے خوش ہوکر فرمایا کہ ''ہمارے طریقہ قادریہ کی تمام نعمت ان کو پہونچ گئیں'' آپ نے سرہند میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا اور مدت تک لوگوں کو فیض پہونچاتے رہے۔ اس کے بعد آپ اکبرآباد تشریف لے گئے اور ایک مدت تک وہاں قیام کیا۔

بیعت خواجہ باقی باللہ: آپ والد کے انتقال کے بعد حج کے لیے روانہ ہوئے تو دلی میں مولانا حسن کشمیری اور نقشبندیہ سلسلہ کے بزرگ خواجہ باقی باللہ سے ملاقات ہوئی۔ اور ان کے یہاں چند روز قیام فرمایا اس کے بعد سرہند واپس چلے گئے دوسری مرتبہ دہلی آئے تو خلعت وخلافت عطا فرمائی اور اپنے مخصوص شاگردوں کو تعلیم کے لیے سپرد کیا۔ تیسری مرتبہ حاضر ہوئے تو خواجہ باقی باللہ نے شہر سے باہر آکر آپ کا استقبال کیا اور بڑی بشارتیں دیں اپنی کم عمری اور ضعف کی طرف اشارہ کرکے اپنے دونوں

لڑکوں خواجہ عبید اللہ اور خواجہ عبد اللہ کو آپ کے پاس تربیت کے لیے چھوڑا اس کے بعد کچھ عرصہ سرہند رہ کر لاہور کا رخ کیا اور وہاں کے علماء سے استفادہ کیا۔ قیام لاہور کے دوران خواجہ باقی باللہ کی وفات کی خبر ملی تو فوراً دہلی کے لیے روانہ ہوئے۔ آپ کے مزار پر حاضری دے کر دہلی میں مستقل قیام کا منصوبہ بنا کر اصلاح و تربیت کی مجلس قائم کی۔ ایک مرتبہ آگرہ کا سفر کیا جہاں ابو الفضل فیضی سے ملاقات ہوئی اور فیضی کی تفسیر (سواطع الالہام) میں اس کی مدد کی لیکن اختلاف کی وجہ سے بے باک ناگواری کا اظہار کیا اور اس کے بعد بلانے پر بھی ملنا گوارہ نہ کیا۔

عادات و اخلاق: آپ سنت کے سخت پابند تھے نعمت حاصل ہونے پر شکر اور تکلیف پر صبر کرتے تہجد کی پابندی کرتے۔ دینی تعلیم کو افضل مانتے۔ تمام اولیاء پر صحابہ کرامؓ کو فضیلت دیتے، چلہ کشی کو غیر ضروری اور خلاف سنت قرار دیتے۔ قبروں کے طواف کرنے اور بوسہ دینے کو مکروہ قرار دیتے اور اس پر سجدہ کرنے کو ناجائز بتاتے، سماع ، رقص، چراغاں اور عرس وغیرہ سے سختی سے منع فرماتے۔ ترک دنیا کو تمام عبادتوں کا سردار قرار دیتے اور کشف و کرامات کے ظاہر ہونے کے قائل تھے۔ مریضوں کی عیادت، رمضان کا اہتمام اور زکوٰۃ کی ادائیگی کا خصوصی خیال رکھتے تھے۔

سماجی حالات: آپ کے زمانہ میں مغل بادشاہ اکبر نے علماء اسلام کے آپسی جھگڑوں کی وجہ سے اپنی کم علمی اور بے دینی کے سبب ملک میں نئے مذہب کو رائج کرنے کی کوشش کی۔ حالانکہ اکبر شروع میں دیندار اور صحیح العقیدہ مسلمان تھا لیکن غیر مسلموں کی قربت اور علماء کے آپسی جھگڑوں سے تنگ آکر اس نے دین الٰہی کی بنیاد ڈالی۔ اس دین میں سود، جوا، شراب اور خنزیز کے گوشت کو حلال قرار دیا گیا، گائے کا ذبیحہ، پردہ اور ختنہ کی ممانعت تھی۔ جسم فروشی کے کاروبار کو منظم کر کے ایک جگہ مقرر کر دی گئی تھی اور سجدۂ تعظیمی کو جائز قرار دے دیا گیا تھا۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے شیخ احمد سرہندی کو مصلح بنا کر بھیجا۔

اصلاحات: ۱۰۱۴ھ میں اکبر کے انتقال کے بعد جہانگیر تخت نشین ہوا جسے اسلام سے کوئی دشمنی نہ تھی مجدد الف ثانی نے اس کو نصیحت کے لیے خانخانہ، سید صدر جہاں، اور مرتضی خاں جو اس کے قریب تھے انہیں خطوط لکھے لیکن آپ کے دشمنوں نے ان خطوط کو غلط انداز میں جہانگیر کے سامنے پیش کیا۔ جس کی وجہ سے جہانگیر مجدد الف ثانی سے بددل ہو گیا اور آپ کو ۱۰۲۸ھ میں گوالیار کے قلعے میں بند کر دیا۔ کیونکہ آپ نے سجدۂ تعظیمی اور آداب شاہی سے انکار کیا تھا۔ آپ نے قلعے میں کئی ہزار غیر مسلم قیدیوں کو مسلمان بنایا ایک مرتبہ جہانگیر نے خواب میں حضور اکرم ﷺ کو دیکھا کہ وہ اپنی انگلی دانتوں میں دبائے فرماتے ہیں کہ ''جہانگیر تو نے کتنے بڑے شخص کو قید کر دیا'' اسے اپنے کیے پر بڑی ندامت ہوئی اور ایک سال کے بعد ۱۰۲۹ھ میں رہا کر دیا۔

مجدد الف ثانی نے اپنی اصلاحات کے ذریعہ مغلیہ حکومت میں ایک نئی روح پھونک دی ان میں امیر کبیر، نواب مرتضٰی خان (سید فرید) صوبے دار گجرات اور پنجاب کے نام خطوط لکھے۔ یہ خواجہ باقی باللہ کے عقیدت مند اور جہانگیر کے مشیر خاص تھے۔ انھوں نے سید فرید کو علماءِ سوء کی ریشہ دوانیوں سے آگاہ کیا اور بادشاہ کو سنتِ نبوی ﷺ پر چلنے اور اہل کفر کو ان کے دین پر چھوڑنے کی صلاح دی۔ ایک دوسرے رکن جان اعظم (جو اکبر کے رضائی بھائی اور گجرات، بہار، بنگال کے صوبے دار تھے) کو جہانگیر کو سمجھانے کی ترغیب دی۔ اس کے علاوہ لالا بیگ صدر جہاں (جنھوں نے جہانگیر کو حدیثیں یاد کرائی تھیں) مکتوبات کے ذریعہ جہانگیر کو اسلامی شعار اختیار کرنے کی صلاح دی۔ ان کوششوں کے نتیجے میں جہانگیر نے چار علماء کی مجلس قائم کی جو اسے احکامات کے بارے میں شرعی نقطۂ نظر سے آگاہ کرتی۔ شیخ نے سید فرید کو لکھا کہ ''چار کے بدلے ایک عالم منتخب کریں تاکہ علماء کا اختلاف فتنہ کا سبب نہ بنے''

مکتوبات اور تصنیفات: آپ کی مشہور تصنیفات میں اثبات النبوۃ، رد

روافض، رسالہ تہلیلیہ، شرح رباعیات، مکاشفات عینیہ اور مکتوبات امام ربانی ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے تقریباً پانچ سو چھتیس خطوط بھی لکھے۔

وفات: ۶۳ سال کی عمر میں ۲۹ ر صفر ۱۰۳۴ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کے بیٹے خواجہ محمد سعید نے نماز جنازہ پڑھائی۔ سرہند میں آپ کی تدفین ہوئی۔ وفات سے پہلے آپ پر حالات منکشف ہونے شروع ہو گئے تھے۔ آپ نے کپڑے تقسیم کروادیئے اور دفن کے لیے وصیت کی۔ انتقال کے وقت دونوں ہاتھ نماز کے طریقے پر بندھے ہوئے تھے اور سیدھے کرنے پر پھر وہیں آجاتے۔

اولاد اور خلفاء: آپ کے سات فرزندوں میں خواجہ محمد سعید، خواجہ محمد معصوم اور خواجہ محمد یحییٰ حیات رہے۔ خواجہ محمد معصوم دہلی میں اس سلسلے کے خلیفہ ہوئے اس کے علاوہ مولانا محمد قاسم کے ہمراہ ستر خلفاء ترکستان، مولانا فرخ حسین کے ساتھ چالیس خلفاء یمن، شام وروم، مولانا محمد صادق کابلی کے ساتھ دس خلفا اور شیخ احمد برکی کے ساتھ تین خلفاء خراسان کی طرف بھیجے گئے۔ ہندوستان میں خواجہ میر محمد نعمان (دکن) شیخ بدیع الدین (سہارن پور)، شیخ طاہر (لاہور) شیخ نور (پٹنہ) شیخ حمید (بنگال) اور شیخ طاہر بدخشی (جونپور) آپ کے مشہور خلفاء ہیں۔

☆☆☆

اہم سوالات

۱۔ تصوف کی تعریف بیان کیجئے؟

۲۔ صوفی کی وجہ تسمیہ سے بحث کیجئے؟

۳۔ تصوف کے ارتقاء پر روشنی ڈالئے؟

۴۔ ہندوستان میں کون کون سے اہم صوفی سلسلوں کو فروغ حاصل ہوا؟

۵۔ قادریہ، نقشبندیہ، چشتیہ اور سہروردیہ سلسلوں کی اہم تعلیمات پر روشنی ڈالئے؟

۶۔ حضرت داتا گنج بخش کی حیات اور خدمات پر روشنی ڈالئے؟

۷۔ خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ نے ہندوستان میں کیا خدمات انجام دیں ان کو واضح کیجئے؟

۸۔ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کی حیات اور خدمات کو بیان کیجئے؟

۹۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کی حیات اور خدمات کا جائزہ لیجئے؟

۱۰۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ (شیخ احمد سرہندیؒ) کے حالات زندگی اور رد بدعت میں ان کی کوششوں کو بیان کیجئے؟

☆☆☆

کتب برائے مطالعہ

۱۔	تاریخ مشائخ چشت	خلیق احمد نظامی
۲۔	بزم صوفیہ	سید صباح الدین عبد الرحمان
۳۔	تاریخ تصوف اسلام	رئیس احمد جعفری
۴۔	تصوف ہماری نظر میں	محمد حسن صفدر
۵۔	تصوف اسلام	مولانا عبد الماجد دریا آبادی
۶۔	اسلامی تصوف	سید عروج احمد قادری
۷۔	حالات وخدمات مشائخ چشتیہ صابریہ	ڈاکٹر رضی احمد کمال
۸۔	آب کوثر	شیخ محمد اکرام
۹۔	رود کوثر	شیخ محمد اکرام
۱۰۔	تصوف ایک تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر عبید اللہ فراہی
۱۱۔	تصوف اور اہل تصوف	سید عروج احمد قادری
		مرتب ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی
۱۲۔	مطالعہ تصوف قرآن وسنت کی روشنی میں	ڈاکٹر غلام قادر لون
۱۳۔	تاریخ تصوف	علامہ محمد اقبال

☆☆☆